مسئلہ خلافت

مسئلہ خلافت

از

ابوالکلام آزاد

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۴۹۱، کوتانہ اسٹریٹ، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

خلافت

"خلافت" عربی کا ایک مصدر ہے اس کا مادّہ ہے "خلف" اور اسی سے ہے "خلیفہ"۔ خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں "من قولك خلف فلان فلانا فی ھذا الامر اذا قام مقامه فیه بعدہ" (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد اس کا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی، اور لغت میں اس کو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہیں گے، خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی یا غیبت کی وجہ سے یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے۔ مفردات امام راغب میں ہے "الخلافة، النیابة عن الغیر اما بالغیبة المنوب عنه، واما لموته، واما لعجزہ واما لتشریف المستخلف" (صفحہ ۱۵۵)

بار اوّل	فروری ۱۹۸۷ء
نام کتاب	مسئلہ خلافت
مؤلف	مولانا ابوالکلام آزاد
ناشر	اعتقاد حسین صدیقی
مطبع	
قیمت	پچیس روپے ۲۵

ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و امنیت کی ایک بہشت زار بناتے!

لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس لیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں اللہ کی نیابت اور قائمقامی رکھتا تھا۔ اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی، اور ہر خلیفہ، سابق کا قائم مقام۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے۔ تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفۃ اللہ صاحب و شارع اسلام تھا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلعم اور پھر ان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی وہ اس خلیفۃ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے اس لیے اُن پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگر مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دینِ حق کے خدمت گزار رہے۔ آیاتِ ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے۔

وھو الذی جعلکم خلائف الارض	وہی پروردگارِ عالم ہے جس نے تم کو زمین میں خلافت دی۔
ویستخلف ربی قوما غیرکم (۱۱ : ۵۷)	اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو میرا پروردگار تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو دے گا۔
ثم جعلناکم خلائف	پھر اُن قوموں کے بعد ہم نے تم کو

یہ لفظ بھی قرآنِ حکیم کے اختیاراتِ لغویہ میں سے ہے۔ یعنی عربی زبان کے ان لفظوں میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرع معنی کے لیے اختیار کر لیا۔ جیسے ایمان بالغیب، تقدیر، بعث، صلوٰۃ و غیر ذالک۔ ایمان کے لغوی معنی یقین و طمانیت اور زوالِ خوف و شک کے تھے، لیکن قرآنِ حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کے لیے استعمال کیا۔ اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور "استخلاف فی الارض" اور وراثت و تمکن فی الارض سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے۔ جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوامِ عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافتِ ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی ہدایت و سعادت کے لیے ایک خاص ذمّہ دار قوم و حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے۔ ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانیت دنیا میں پھیل جاتے، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانونِ عدل جو تمام کائناتِ ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرّات تک نافذ و قائم ہے، اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراطِ مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ زمین کے گوشے گوشے اور چپّے چپّے میں جاری و ساری

فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر، وللہ عاقبۃ الامور (۲۲ : ۴۱)

میں جما دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے دنیا کو روکیں گے۔

اس آیتِ کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ تمکین فی الارض یعنی حکومت کا مقصدِ اصلی قرآن کریم کے نزدیک کیا ہے؟ معلوم ہو گیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے، نیکی اور راستی کا اعلان و ظہور ہو، برائی سے نوعِ انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے۔

دوسری آیت میں اس کو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم، ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لایشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ھم الفاسقون (۲۴ : ۵۵)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا ٹھیک اسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے اور ایسا کرے گا کہ ان کے لیے ان کا دینِ حق قائم ہو جائے گا اور خوف کی گھڑیاں امن کی خوشحالی و کامرانی سے بدل دی جائیں گی۔

فی الارض من بعد ھم	ان کی جگہ دی تا کہ دیکھیں تمہارے
لننظر کیف تعملون (۱۰ : ۱۴)	کام کیسے ہوتے ہیں۔
واذکروا اذ جعلکم خلفاء	اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے
من بعد قوم نوح (۷ : ۶۹)	بعد ان کا جانشین بنایا۔
یا داؤد انا جعلناك	اے داؤد ! ہم نے زمین میں تم کو
خلیفۃ فی الارض (۳۸ : ۲۶)	خلیفہ بنایا۔

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے تعبیر کیا گیا۔

ولقد کتبنا فی الزبور من	اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی
بعد الذکر ان الارض یرثھا	تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے
عبادی الصالحون	صالح بندوں ہی کی وراثت میں
(۲۱ : ۱۰۵)	آئے گی۔

یہی چیز زمین کی "تمکین" یعنی طاقت وعظمت کا جماؤ اور قیام بھی ہے جو سر زمین فراعنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی جبکہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق وصالح کی قوت سے ایک دن مصر کے تاج وتخت کا مالک ہو گیا۔

کذالك مکنا لیوسف	اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت
(۱۲ : ۵۶)	مصر میں قائم کر دی۔

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

الذین ان مکناھم	وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین

وجود نہیں رکھتا۔ ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے اور اس کا مٹانا اس کے ظہور کا پہلا کام تھا۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ (۹ :۳۲) اور ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم والنبوۃ، ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ، ولٰکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون۔

(۲ : ۷۹)

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہُوا۔ آٹھ نو سال بعد جب داعیٔ اسلام دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار میں آ چکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کے لیے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں۔ اس سلسلۂ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفۃ اللہ خود حضرت داعیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مقدس تھا۔ اور آپ نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ وہ آپ کے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔ "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" (ابن ماجہ عن العرباض بن ساریہ) وامثالھا آپ کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفۂ رسول تھے۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سرو سامانی کی حالت کے ساتھ دشمنوں کے پے در پے حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتھیار اپنے جسم سے دُور نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا مایأتی علینا یوم نأمن فیہ و نضع عنہ السلاح ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں گذرا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح شام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کر سکتے۔ ابوالعالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا، مظلومی و بیچارگی کی جگہ فرمانروائی و کامرانی ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضۂ اقتدار میں آ جائے گی (تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۱۲۲)

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز "خلافت" ہے وہ خلافت فی الارض ہے یعنی زمین کی حکومت و تسلط۔ پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اُسے حاصل نہ ہو۔ وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔ اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خدا اور رسول کے سوا کوئی انسانی

کا تھا، جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔ یہ سلسلۂ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اقرب تھا، لیکن خلافتِ راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہو گئے تھے۔ خلفاء بنو امیہ سے لے کر آج تک جو سلسلۂ خلافتِ اسلامیہ جاری ہے، وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ طریق غلبہ ہدایت و نبوت خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبۂ سیاست و شخصیت بادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

"الخلافة بعدی ثلثون عامًا ثم ملك بعد ذلك" (اخرجه اصحاب السنن) اور حدیثِ ابوہریرہؓ "الخلافة بالمدینة والملك بالشام" ایک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بتلائے گئے ہیں: "نبوة ورحمة ثم خلافة ورحمة وفی لفظ خلافة علی منهاج النبوة ثم یکون ملك عضوض رواه البزار وقال السیوطی حسن) امیر معاویہ نے اس کی نسبت کہا تھا، ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کر لی۔"

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے۔ عہدِ نبوت و رحمت، خلافتِ رحمت، پادشاہی و فرمانروائی۔ پہلا دور آنحضرت صلعم کی وفات پر ختم ہو گیا۔ دوسرا دور فی الحقیقت عہدِ نبوت کا ایک تتمہ اور لازمی جز تھا (جیسا کہ سلسلۂ دعوت اور تکمیل کاروبار شرائع میں ہمیشہ سنت اللہ رہی ہے) جو حضرت امیر علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مجرد عہد پادشاہی و استبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں

خلافتِ خاصّہ و خلافتِ مُلوکی

آنحضرتؐ کے بعد خلافت اپنے خصائص و نتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہو گئی۔ خود آنحضرت نے نہ صرف ان کی پیشتر سے خبر ہی دے دی تھی، بلکہ تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان کر دیئے تھے۔ اس بارے میں جو احادیث مذکور ہیں، وہ کثرتِ طُرق، شہرتِ متن، قبول طبقات کی بنا پر حدِّ تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ پہلا سلسلہ خلافت خلفاء راشدین مہدیین کا تھا جن کی خلافت منہاجِ نبوت پر تھی؛ یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصبِ نبوت کے جانشین اور جامعیتِ شخص رسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریقِ کار ٹھیک ٹھیک طریقِ نبوت کے مطابق تھا، اور اس لیے گویا عہدِ نبوت کا ایک آخری جزو تھا۔ اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح ان کی شخصیت بھی جامع و حاوی تھی۔ دینی دعوت اور شرعی اجتہاد امر حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظامِ شرع نظامِ شریعت اور نظامِ سیاست، یہ تمام قوتیں ان کی ذاتِ واحد میں جمع تھیں۔ ان کی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومتِ شوریٰ جس کو آج کل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ری پبلک کہہ سکتے ہیں یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔

دوسرا سلسلہ خلافت منہاجِ نبوت سے الگ مجرّد حکومت و بادشاہت

نہیں کہا جا سکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اس کا اختتام؟ یہی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہو کر رہے گا۔

لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۶۱ : ۹)

دین اسلام اور اس کا رسول اس لیے آیا کہ تمام دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہو کر رہے (کیونکہ آخری غلبہ و بقا صرف اصلح کے لیے ہے اور تمام دینوں میں اصلح صرف اسلام ہی ہے)

یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، ایک مومن قلب کے لیے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں۔ بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ طلوع صبح کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ ان موعدھم الصبح الیس الصبح بقریب۔

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

علیحدہ علیحدہ احادیث میں بتلائی گئی تھیں، اور وُہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں۔ نبوت و رحمت کی برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا، اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی۔ کالحصیر عوداً عوداً جو حضرت عثمانؓ کی شہادت سے شروع ہوئی اور جسقدر عہدِ نبوت سے دوری بڑھتی گئی۔ اتنی ہی عہدِ نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافتِ کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی، بلکہ قوام و نظام امت کے مبادیات و اساسات سے لے کر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک، ساری باتوں کا یہی حال ہوا۔ فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوتے تھی جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابۃ بالفتن) حضرت عمرؓ کا وجود تھا۔ جونہی یہ بنیان مرصوص ہٹی، وہ سیلابِ عظیم امنڈا اور پھر کوئی سد و بند اس کی راہ کو نہ روک سکا۔ اسی سیلاب کو حضرت حذیفہ کی روایت میں " التی تموج کموج البحر" (رواہ البخاری) سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اس کی موجیں اٹھیں گی سو واقعی اٹھیں، اور دور خلافت و رحمت اور خلافۃ علی منہاج النبوۃ کی عظیم الشان عمارت اس کے تلاطم و طغیان میں آناً فاناً بہ گئی۔

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اوّل کے خصائص تازہ کردے گا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ "لایدری اولھا خیراً ام آخرھا"

مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فردِ واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور تمام مواد، قویٰ، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ بحدیکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہمدگر جڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے، کسی چیز کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار، اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین اور وجود و ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبۂ "تخلیق" و "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ الذی خلق فسوّٰی (۸۷ : ۲) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف، اور موت و فنا نہیں ہے۔ مگر اس کی ضد، یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اس کو "خیر" اور شریعت کی زبان میں "عمل صالح" اور "حسنات" کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں "تندرستی" سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ "زندگی" ہے اور پھر یہی حالت ہے جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اُس کا نام "حیاتِ قومی و اجتماعی" ہوتا ہے اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں

عہدِ اجتماع و ائتلاف و دورِ اشتات و انتشار

آپ آزردہ خاطر نہ ہوں اگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کے لیے مجھے اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کرے۔ اس مقام کی مزید وضاحت کے لیے بہتر ہوگا کہ دو خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں۔ ایک "اجتماع اور ائتلاف" ہے دوسرا "اشتات" اور "انتشار"۔ نہ صرف امتِ اسلامیہ بلکہ تمام اقوامِ عالم کی موت وحیات، ترقی و تنزل، اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآنِ حکیم نے بیان کیے ہیں، ان کی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ "اجتماع" کے معنی ہیں ضم الشئ بتقریب بعضہ من بعض (مفردات امام راغب ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا۔ اور ائتلاف "الف" سے ہے اس کے معنی ہیں ماجمع من اجزاء مختلفۃ و رتب ترتیباً، قدم فیہ ماحقہ ان یقدم و اخر فیہ ماحقہ ان یؤخر" (مفردات ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیئے وہی جگہ اُسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے جس کو آخری جگہ ملنی چاہیئے وہ آخری جگہ پاتے۔" عہدِ اجتماع و ائتلاف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک

اور عصیان سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار عروج کی جگہ تسفّل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا "اجتماع و ائتلاف" کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد، اور اس لیے انسان کے لیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اس کو "اعتصام بحبل اللہ" اور اسی طرح کی تعبیراتِ عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اوّلین مادۂ تکوین امت یعنی اہلِ عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً۔

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو سب کے ہاتھ اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے تم سرفراز کیے گئے۔ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوتے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

معنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح، اس کا قانونِ حیات و وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے

ولنعم ما قیل:

عباراتنا شتی وحسنک واحد — وکل الی ذاک الجمال یشیر

اس حالت کی ضد "اشتات و انتشار" ہے۔ "اشتات" "شتت" سے ہے جس کے معنی لغت میں "تفریق" اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ "یقال شت جمعھم شتا وشتاتا وجاؤا اشتاتا ای متفرقا" اشتاتاً (مفردات:۲۵۶) قرآن حکیم میں ہے یومئذٍ یصدر الناس اشتاتاً (۹۹ : ۶) اور من نبات شتی (۲۰ : ۵۳) اور وقلوبھم شتی (۵۹ : ۱۴) ای مختلفۃ۔ انتشار "نشر" سے ہے اس کے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی متفرق کے۔ سورۂ جمعہ میں ہے فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا یعنی تفرقوا اشتات و انتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جائے، متفرق اور پراگندہ ہونے اور باہمدگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مواد میں، قویٰ میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو "تکوین" کی جگہ "فساد" اور "وجود" کی جگہ "عدم و فنا" کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام پہلے "بیماری" اور پھر "موت" ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اسی کو قرآنِ حکیم اپنی اصطلاح میں "عمل سوء"

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہورِ شریعت و نزولِ وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہو، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور اسی لیے یہ نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان اور اس کو بالکل ترک کر دینے کا ہے:

فما اختلفوا حتی جاءھم العلم (۱۳ : ۹۳) وآتیناھم بینات من الامر فما اختلفوا الا من بعد ما جاء ھم العلم بغیا بینھم (۴۵ : ۱۶) ولا تکونوا کالذین تفرقوا من بعد ما جاء ھم البینٰت (۲ : ۱۰۴)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے۔ اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیۃ" اور "حیاتِ جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے بالتفصیل آئے گا۔ "من فارق الجماعۃ، فمات میتۃ الجاھلیۃ" اور اسی بنا پر بکثرت وہ احادیث و آثار موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزامِ جماعت اور اطاعتِ امیر کا حکم دیا گیا۔ اگرچہ امیر غیر مستحق ہو، نااہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے (ما اقاموا الصلوٰۃ) اور ساتھ ہی بتلا دیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا یعنی گمراہی اور ٹھوکر اس کے لیے ضروری ہے۔ زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقا و قیام نہیں ہو سکتا وہ بلا کی ایک آگ ہے جس کے دہکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشوونما نہیں پا سکتی۔

وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار، فانقذکم منہا، کذالک یبین اللہ لکم اٰیتہ لعلکم تہتدون

اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دہکتے ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے پر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اپنے فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھولتا ہے تا کہ کامیابی کی راہ پا لو!

یہ بھی بجا بتلا دیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دے۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعًا، ما الفت بین قلوبہم ولکن اللہ الف بینہم انہ عزیز حکیم۔

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان بکھرے ہوتے دلوں کو محبت و اتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا۔

نہیں ہوسکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا ہونے نہ دے گا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جاتے۔

اسی طرح جماعت کی نماز کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نااہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا کہ صلوا خلف کل بر و فاجر تو اس میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے۔ انفراد و فرقت ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیئے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھائی گئی، اس میں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی " اهدنا الصراط المستقیم" فرمایا نہیں کہا گیا۔ یہ اسی لیے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شئی نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور ذات کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو اسی لیئے اس دعا میں کہ حاصل ایمان و خلاصۂ قرآن، وعصارۂ اسلام ہے متکلم جمع کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا سکھائی گئی وہ بھی بصیغہ جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو۔ یعنی "السلام علیکم" " السلام علیک" نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کے لیے بھی السلام علیکم بصیغہ جمع رکھا گیا۔ واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔ علت اس

حکم رکھتی ہے جس کو انگوٹھے سے مسل دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرت صلعم سے روایت کرتے ہیں "علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد" دوسری روایت میں ہے" فان الشیطان مع الواحد" یعنی جماعت سے الگ نہ ہو ہمیشہ جماعت بن کر رہو کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا۔ دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دُور رہے۔ یعنی اتحادی وجماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی۔ اب وہ راہِ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔ یہ الفاظ مشہور خطبہ جابیہ کے ہیں جو عبداللہ بن دینار، عامر بن سعد سلیمان بن یسار وغیرہم سے مروی ہیں۔ اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح متواتر بالمعنیٰ "علیکم بالسواد الاعظم اور فانہ من شذ شذ فی النار اور ید اللہ علی الجماعۃ اور لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ او کما قال اور خطبۂ حضرت امیرکہ: وایاکم والفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم بلذئب الا من دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولوکان تحت عمامتی ھذا وغیر ذلک اس بارے میں معلوم ومشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہو کر رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ

بالسھر والحمّی (صحیحین) اور "المسلم للمسلم کا لبنیان یشد بعضہ بعضًا (بخاری) یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اُٹھ رہا ہو اور ان کی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی ہے اور سہارا دیتی ہے پھر تشبیک اصابع کر کے اس کی تصویر بتلا دی۔ یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جُڑا ہوا اور متصل ہے۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے، تو اجتماعی وجود ہے یعنی دیوار کا ایک جزء ہے، اور انہی اجزاء کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۂ صفوف پر سخت زور دیا گیا یعنی صف بندی پر۔ اور سب کے سروں، سینوں، پاؤں کے ایک سیدھ میں ہونے پر لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم (بخاری) اور روایت انسؓ کہ "سووا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ" (بخاری) وفی لفظ من تمام الصلوٰۃ" تو اس میں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقع نہیں۔ قرآن و سنت کی تصریحات و

کی یہی ہے۔ نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی۔

اور اسی بنا پر احکام و اعمالِ شریعت کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و ائتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے نماز کی جماعتِ خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع اور کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مالِ اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دے دینا ہے۔ علاوہ بریں اس کی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے بلکہ مصارفِ زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفہ کے سپرد کر دے۔ پس اس کے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اس کا مصرف تجویز کرے۔ اور مصارفِ منصوصہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو، اس کو ترجیح دے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے۔ جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ "مثل المؤمنین فی توادھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو، تداعی لہ سائر الجسد

نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں۔ اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو۔ مگر اصلی علت اس کے سوا کوئی نہیں۔

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی۔ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو صرف ایک داعئ شریعت یا حامل وحی الٰہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی بلکہ اُن ساری قوتوں، سارے منصوبوں، ساری حیثیتوں، اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قویٰ کی، جو آپ کی شخصیتِ مقدسہ میں اکٹھی تھیں اور جن کا آپ کے تنہا وجودِ مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا، اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالمستان شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہے اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وُہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصوبوں کا جامع تھا۔ جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں۔ وہ اللہ کا پیغمبر تھا، شریعت کا مقنن تھا۔ امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک

حکمیات اس بارے میں اس قدر کثرت سے اور محتاج تفسیر وکشف ہیں
کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب۔ تفسیر البیان میں مفصل لکھ چکا ہوں۔

جمع وتفرقہ قویٰ ومناصب

اس قانون الٰہی کے مطابق مسلمانوں کی زندگی وعروج کا اصلی دَور وہی
تھا جب ان کی قومی و انفرادی، مادی ومعنوی، اعتقادی وعملی زندگی پر
اجتماع و ائتلاف کی رحمت طاری تھی اور ان کے تنزل وادبار کی اصلی بنیاد
اسی دن پڑی، جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست
چھانی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا۔ ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی
ہر چیز بندھی ہوئی تھی، لیکن بتدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ
ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ پھیلا۔ ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو
کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون تنزل
اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشۂ وجود وعمل پر طاری ہوئی
اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گذر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور
بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسباب تنزل امت پر بحث کرتے اور پھر طرح
طرح کی علتیں ٹھہراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ
قرآن وسنت اور عقلیاتِ صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات و

کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ اس کی جگہ کسی دوسری کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی، ورضیت لکم الاسلام دیناً

لیکن منصب نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا، اور ضرور تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے لیے "محدث" (بالفتح) کا مقام تبلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ مبشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا: لم یبق الا المبشرات" حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی، اس میں وحی و تشریع کی قائمقامی تو نہیں ہو سکتی تھی! لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوام سیاست قیادت فوج و حرب، فتح و عمران ممالک، ریاست مجالس شوریٰ وغیرہ، جہانبانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا۔ اس لیے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفائے راشدین کا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت و خلافت بھی تھے، صاحب اجتہاد و قضا بھی تھے، اور صاحب سیاست و تنظم احکام بلاد بھی۔ اصلاً "امامتِ کبریٰ" کا مقام

تھا۔ وہ اگر ہتّوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا، تو اُسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدانِ جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالارِ لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظامِ معاشرت درست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا ہے۔ غرضیکہ اُس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے اور اسلام کا نظامِ دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماعِ دنوی و مناصب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اُس کو "منہاجِ نبوت" سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوت کی سچی قائمقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔

منصب نبوت مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے ازاں جملہ ایک جزو وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئولانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون

بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں، اور اسی لیے ان کا وجود اور ان کے اعمال بھی اعمالِ نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین اور اسی لیے وعضوا علیھا بالنواجذ کے حکم میں نہ صرف سنتِ عہدِ نبوت بلکہ خلافت راشدہ وخاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی۔ اور شرح اس سرِّ الٰہی کی بہت طولانی ہے۔ یہاں محض اشارات مطلوب ہیں۔

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دے دی گئی تھی، اجتماع و ائتلاف کی یہ حالت حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ ازاں جملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا جس سے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی درہم و برہم کر دیا۔ خلافتِ خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں ان کا ظہور اور نشو و نما ہوا۔ حکومت و فرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر مجرّد پادشاہی کی شکل میں آگیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا "الخلافۃ بعدی ثلثون سنۃ ثم ملک" سو واقعی اس کے بعد صرف پادشاہی رہ گئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا اسی طرح تعلیم و تربیت روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہوگیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لیے اور فقہاء کا مجرّد استنباطِ احکام و مسائل کے

اجتہاد دینی اور سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے اس لیے ان کی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں حضرت عمرؓ مسجد کے دارالشوریٰ میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے۔ عدالت میں مقدمات سنتے تھے، اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے۔ اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے۔ تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدانِ جنگ میں احکام بھی وہی بھیجتے، اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی وہی بلاتے۔

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے ان کو تین اُصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے: یتلوا علیھم اٰیٰتہٖ، ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ

تلاوتِ آیات، تزکیہ نفوس، تعلیم کتاب وحکمت خلفاء راشدین ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوتِ ارشاد و تزکیہ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے، ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکی بخشتے، اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت و سنت سے اُمت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہؒ شافعیؒ بھی تھے اور جنیدؒ اور شبلیؒ بھی، نخعیؒ و حمادؒ بھی تھے اور ابن معینؒ اور ابن راہویہؒ بھی جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ دلوں کی حکمرانی

قریشی رہا ہو، یا غیر قریشی، مجرّدِ ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا، اور بجز چند
مستثنیٰ اوقات کے (جیساکہ عہدِ حضرت عمر بن عبدالعزیز) بہ نیابت نبوت
کے اور تمام اجزار سے ایک قلم خالی رہا۔ منصب بٹ چکے تھے۔ قوتیں منتشر
ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خان کے زمانے میں ہُوا اور جس
کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی و شخصی سے طریقِ
شوریٰ میں تبدیل ہو گئی، سو بلاشبہ خلافتِ راشدہ کی طرف عود و رجعت
کا یہ ایک مبارک قدم تھا جس کے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب
سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص
ہر دور اور ہر سلسلے کے وہی رہے جو ایک جامع لفظ "ملک عضوض"
میں بتلا دیئے گئے تھے۔ اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائیدار
تبدیلی نہ ہوئی۔

اطاعتِ خلیفہ و التزامِ جماعت

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے
یعنی اسلام کا وہ نظامِ شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفۂ وقت کی معرفت اور
اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت

لیے رہ گیا، تو تزکیۂ نفوس اور ارشاد قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی، جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا۔ وہ بادشاہ مجتہد، مرشد، قاضی القضاۃ، سپہ سالار جنگ، میر عدل و احتساب سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفقہ کے لیے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضا کے لیے تیسرا ارشاد و تزکیۂ قلوب کے لیے، چوتھا وھلم جرا۔ غرضیکہ عہد اجتماع قوی و مناصب کے بعد دور انتشار قوی و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہوگئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع نہیں یا اب مختلف وجودوں میں بٹ کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا۔ بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہوگئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سرمست ہو۔ افسوس کہ سطحی و جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی، اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر سے اسباب ترقی و تنزل پر تدبر کرتے!

غرضیکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلۂ خلافت قائم ہوا، وہ خواہ

کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیت پر متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں، ہر دائرہ کا نقطۂ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے اپنے کعبۂ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف و دوران کے لیے حکمت الٰہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دے دیا ہے وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ سب بحکم ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض (۳: ۸۳) اور ان اللہ یسجد لہ من فی السمٰوٰت و من فی الارض والشمس والقمر والنجوم خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں: لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار و کل فی فلک یسبحون۔

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اُترتے آئیں گے، اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو۔ اس کی ایک مجتمع وحدت کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں، شاخیں

پر جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائناتِ ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قوام ہستی کی زنجیر فطرت کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنت ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو "قانون مرکز" یا "قانون دوائر" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کے لیے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلہ مرکز کے ہوتا ہے اور بقیہ اجسام ایک دائرے کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں اور پورے دائرے کی زندگی اور بقا صرف اس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر چشم زدن کے لیے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں۔ یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہو جاتے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا "الحقیقۃ کالکرۃ" اور صاحب فتوحات نے کہا : کہ

دائرہ قاب قوسین ہے۔

یہ قانون مرکزیت دوائر نظام ہستی کے ہر جزو اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کرّوں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیّر العقول طلسم

ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے۔ اسی طرح
نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے پس ان کی اطاعت
و انقیاد و بقا کے لیے ناگزیر ٹھہری: وما ارسلنا من رسول الا
لیطاع باذن اللہ دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اس لیے کہ اس
کی اطاعت کی جائے اور اسی لیے فرمایا: فلا وربك لا یومنون
حتی یحکموك فیما شجر بینھم، ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجًا
مما قضیت ویسلّموا تسلیما اور لقد کان لکم فی رسول
اللہ اُسوۃ حسنۃ۔ پھر قوم و ملت کے بقا کے لیے ہر طرح کے دائرے
اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے۔ اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدۂ توحید کو ٹھہرایا
جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے: ان اللہ لا یغفر ان یشرك به
ویغفر مادون ذلك لمن یشاء ، عبادات میں نماز کو مرکزی عمل
ٹھہرایا جس کے ترک کر دینے کے بعد تمام دائرۂ اعمال منہدم ہو جاتا
ہے۔ فمن اقامها اقام الدین ومن ترکها فقد هدم الدین" اور اسی
لیے یہ بات ہوئی کہ کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئًا
من الاعمال ترکه کفر غیر الصلوۃ (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے
ترک کر دینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کرنے کو۔ اسی طرح
تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادیٔ حجاز کا کعبۃ اللہ قرار
پایا: جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیامًا للناس" قیامًا للناس پر
غور کرو اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا۔ اس لیے تمام دائرہ کا رُخ بھی اسی

ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی موت و فنا اس پر طاری ہوگئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم الفنس کی طرف آؤ اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کے لیے نظر اُٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے۔ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے جو تم میں آباد ہے۔ ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ، لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سربسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے۔ اس سے الگ رہ کر ایک عُضو بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اذا صلحت، صلحت کلہا و اذا فسدت فسدت کلہا۔

اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اگر نوعِ انسانی کی سعادت و ارتقاء کے لیے قانون اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانون حیات بنایا تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزو نظر آئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی۔ پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیت پر قائم ہوا۔ قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے، اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقا بھی قانون مرکزیت پر موقوف ہے جس طرح

خیرو احسن تاویلاً

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی، رسول کی، مسلمانوں میں جو اولی الامر ہو، اس کی۔ اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے۔ باقی رہی اطاعت اولی الامر، تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ اولی الامر سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا، نظام امت قائم رکھنے والا، اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے۔

اولاً، بحکم "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" اولی الامر کی تفسیر خود قرآن ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے۔ اسی سورت میں آگے چل کر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے۔

وا ذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذا عوا بہ ولو ردوہ الی الرسول و الی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم۔

اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر ان تک پہنچتی ہے تو بلا سوچے سمجھے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے جو ان میں اولی الامر ہیں، تو فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا پتہ لگا لیتے۔

طرف ہوا۔ خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں لیکن ان کا منہ اسی طرف ہونا چاہیئے۔ وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ (۲ : ۱۴۵)

پھر جس طرح شخصی و اعتقادی اور عملی زندگی کے لیے مراکز قرار پائے ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے لیے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہٰذا وہ مرکز بھی قرار دے دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے ٹھہرایا۔ اس کی معیت، اس کی رفاقت، اس کی اطاعت اس کی حرکت پر حرکت، اس کے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک اس کی دعوت پر انفاق جان و مال، ہر مسلمان کے لیے فرض کر دیا گیا ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام "خلیفہ" اور امام ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے۔ یعنی کتاب و سنّت کے مطابق اس کا حکم ہے، ہر مسلمان پر اس کی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اس کے رسول کی۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ و الرسول، ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذلک	مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تم میں جو اولی الامر ہو اس کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹو اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہو

سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "امر" جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے جیسی کہ بیان ہے تو اس کا اطلاق عموماً حکومت و سلطنت ہی کے معنوں پہ ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے موجود ہے کہ صاحب نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ "امر" کے معنی حکم کے ہیں اور "اولی الامر" کے معنی امام بخاری نے "ذوی الامر" کیے ہیں۔ یعنی "حکم والا" اور معلوم ہے کہ صاحب حکم وہی ہو سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

ثالثاً، احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود آیت جس واقعہ کی نسبت اتری، وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے۔ عن ابن عباس نزلت فی عبد اللہ بن حذافہ بن قیس ابن عدی اذ بعثہ النبی صلعم فی سریۃ" اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کی باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا ان کے حکم کے ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا تھا" نزلت فی قصۃ جرت لعمار مع خالد اذ کان خالد امیرا فاجار عمار رجلا بغیر امرہ فتخاصما دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت و عدم اطاعت کا تھا، نہ کہ احکام و مسائل کے حکم و افتار کا۔

رابعاً اکثر اقوال مرویۂ صحابہ و تابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے بلکہ صدرِ اوّل میں صرف یہی تفسیر مشہور و معلوم تھی۔ بہت سی موشگافیاں

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جب امن وخوف یعنی صلح وجنگ اور فتح وشکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں اور بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب وغلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی وجہ سے عہد نبوی میں بھی پیش آجاتی تھیں۔ پس فرمایا کہ جب کوئی افواہ سُنو تو پہلے اللہ کے رسُول اور اپنے اولی الامر تک پہنچاؤ تاکہ وُہ اس کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کرلیں اور خبر کی نوعیت اور راویوں کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج استنباط کریں۔ ایسا نہ کرو کہ جہاں کوئی افواہ سُنی فوراً اس پر یقین کر لیا اور لوگوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ اس آیت میں "اولی الامر" سے مقصود کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ذکر امن وخوف کے حالات کا ہے۔ یعنی صلح و جنگ اور فتح وشکست کا ان حالات کا تعلق صرف حکّام و امراء ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ علماء وفقہاء سے نہیں ہو سکتا۔ معاملہ نظم وملک و قیامِ امن کا ہے۔ استنباطِ مسائل اور حلال وحرام کا نہیں ہے۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اولی الامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپُردِ ملک کا انتظام اور جنگ وامن کا نظم ونسق ہوتا ہے، اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں۔ جن کا اثر ملک کے امن وخوف پر پڑ سکتا ہے۔ یعنی اربابِ حکومت وامارت۔

ثانیاً، کتاب وسنت اور صدرِ اوّل کے آثار عربیت پر غور کرنے

انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں۔ پس جو شخص والیٔ ملک اور حاکمِ مسلمین ہوتا تھا وہ بدرجہ اولیٰ عالم و فقیہ بھی ہوتا تھا۔ پس جن صحابہ و تابعین نے "اولوالامر" کی تفسیر میں علم و خیر کا ذکر کیا، انہوں نے واقعی بہت صحیح تفسیر کی گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولوالامر ایسے ہی افراد کو ہونا چاہیئے جو اہلِ علم و خیر ہوں۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولوالامر سے مقصود علما و فقہا کا وہ مخصوص و متعارف گروہ ہے جو اسلام کے نظام جماعت کے انقراض کے بعد پیدا ہوا اور جس کا صدرِ اول کے مفسرین کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا؟

امام ابن جریر نے عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے "ابوبکرؓ و عمرؓ" اس سے بھی ان کا مقصود یہی ہے کہ اولوالامر مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جیسے ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما۔

اصل یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے حجاز میں ایک طرح کی باقاعدہ طوائف الملوکی قائم تھی اور نہ میں قریش کا قبیلہ بالکل خود مختار اور غیر مسئول تھا۔ اسلام کا جب ظہور ہوا تو اس نے "جماعت" اور "امارت" کے نظام پر زور دیا اور بڑے بڑے گردن کشوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اطاعت امیر و التزام جماعت سے باہر نہ ہوں۔ قریش کی نسلی فطرت اس اطاعت کیشی کے خلاف تھی، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کو اس بات کا خوگر بنانا تھا۔ حافظ عسقلانی نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ "ورجح الشافعی الاول واحتج بان قریشا کانوا لا یعرفون الامارۃ و لا ینقادون الی امیر

جو پیدا کی گئیں ہیں، سب بعد کے مفسرین کی طبع زاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے۔ سالت زید بن اسلم عنہا ولم یکن با المدینۃ احد یفسر القرآن بعد محمد بن کعب مثلہ۔ فقال اقراء ما قبلہا تعرف فقرأت۔ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلہا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ فقال ھذا فی الولاۃ"

(یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا اس آیت سے ما قبل پڑھو۔ میں نے پڑھا۔ "ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلہا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل" پس کہا کہ مقصود اس سے حکام ہیں یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت وقضا کا ہو رہا ہے پس اولی الامر سے مقصود ہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں) طبری نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہ اور میمون بن مہران وغیرہ سے نقل کیا ہے "ھم الامراء" اور علامہ ابن حزم نے ان تمام صحابہ و تابعین کو شمار کیا جن سے یہ تفسیر منقول ہے تو ۱۳ سے زیادہ ثابت ہوتے۔ باقی رہا بعض صحابہ و تابعین کا کہنا کہ مقصود اہل علم و نظر ہیں۔ مثلاً جابر بن عبداللہ کا قول کہ "ھم اھل العلم والخیر" اور مجاہد و عطا و ابو العالیہ کا قول کہ ھم العلماء تو ان اقوال میں اور صحابہ کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے در اصل اسلام کا نظام حکومت وجماعت تو یہی تھا کہ حکومت وولایت کا منصب تمام شرعی وعلمی قوتوں سے مرکب ہو اور اس وقت تک قوتوں کے

کے شیوع اور یونانیت کے غلبہ و احاطہ سے علوم دینیہ میں اس تعمق کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں۔ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "هلك المتعمقون" فکر و نظر میں عجمیت کے ظہور، عربیت خالصہ و صالحہ کے بعد، اور علوم سنت کے ترک و ہجر نے اس معاملہ کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اوائل و سلف میں یہ تمام اختلافات یک قلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور ہر لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے۔ جو عربی لغت و محاورہ میں ہو سکتے ہیں اور لوگ اس پر قانع تھے۔ ابداع معانی کثیرہ اور تفحص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کاوش ہی نہیں کی جاتی تھی۔ نہ فرضی تخمینی شکوک و ایرادات گھڑ کرنئے نئے معانی فرض کیے جاتے تھے "اولوالامر" کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائے گا۔ جس کی عربیت خالص و صحیح ہو تو صرف ایک ہی معنی اس کے ذہن میں آئیں گے۔ یعنی صاحب حکومت، کسی دوسرے مفہوم کا اُسے وہم بھی نہیں گذرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے۔ لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وُہ امکانی مطالب کا وسیع سے وسیع میدان ڈھونڈتے ہیں اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کے لیے اختیار کر لینا چاہتے ہیں پس متأخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیئے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو۔ اور لغت و عربیت اس کی تصدیق کرے۔ متأخرین کی کاوشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تفنن ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے۔

فامروا بالطاعة لمن ولی الامر، ولذالک قال صلعم من اطاع امیری فقد اطاعنی (فتح ۸: ۱۹۱)

خامساً تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ یعنی امام بخاریؒ کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں باب باندھا" اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم اور اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت درج کی ہے "من اطاع امیری فقد اطاعنی الخ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ جس نے اس سے انکار کیا اس نے خود مجھ سے انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک اولوالامر کی اطاعت سے مقصود امیر و امام ہی کی اطاعت ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں " فی ھذا اشارۃ من المصنف الی ترجیح القول الصائر الی ان الایۃ نزلت فی طاعۃ الامراء، خلافا لمن قال نزلت فی العلماء"

سادساً سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ و نظر معلوم۔ انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کرکے ترجیح اسی تفسیر کو دی ہے۔

سابعاً اس نکتہ پر نظر رہنی چاہیئے کہ تفسیر قرآن کے معاملہ میں جس قدر اختلافات کی کثرت اور مذاہب و طرق کا تعدد و تنوع نظر آتا ہے، وہ تمام تر متاخرین کی فلسفیانہ کاوش کا نتیجہ ہے جب کہ معقولات

بحثیں اس لیے پیدا ہوگئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر ڈالی گئی اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوتی کہ شریعت کے نفاذ اور امت کے قوام و نظام کے لیے ایک مرکزی اقتدار ناگزیر ہے اور وہی امام اور اس کے نائب امراء ہیں، تو اولی الامر کا مطلب بالکل صاف تھا۔ کسی کاوش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔

"فان تنازعتم الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک "اربابا من دون اللہ میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ، ارضی خلیفہ نہیں ہے آسمانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے لیکن اسلامی خلافت کی اصلی بناپر خلافت ارضی یعنی حکومت وسلطنت ہے وہ صرف شریعت اور امت کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ ہے نہ کہ مقننہ۔ اس کی ذات کو اصل شریعت اور اس کے احکام میں کوئی دخل نہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوہ الی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس میں نزاع و اختلاف پیدا ہو، تو پھر اس کے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ مرکز اولی و حقیقی کا، یعنی قرآن و سنت کا۔ اور خلیفہ خود بھی اس کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے۔ جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد۔

یہی وجہ ہے کہ اطیعوا اللہ کے بعد پھر اطیعوا الرسول میں فعل کا اعادہ کیا گیا۔ مگر اولی الامر میں نہیں کیا گیا۔ تاکہ واضح ہوجائے کہ اصل

لیکن تفسیر قرآن نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہو سکتی ہے جو خود حامل قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو اور ان لوگوں نے بتلائی ہو جن کے علم و عمل پر خود اللہ نے اپنی رضا و پسندیدگی کی شہادت دی ہے: رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ اگر سلف سے اعراض و انکار اس بنا پر ہے کہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے نا آشنا تھے تو کم از کم قرآن کا علم تو ان کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل ہوا ہو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، لیکن اس کے معانی و مطالب اس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہ ہوں جب تک ارسطوئے یونانی ان کی رہنمائی نہ کرے؟

امام رازی وغیرہ کو زیادہ حیرانی اس بنا پر ہوئی کہ اولو الامر کی اطاعت کا ذکر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ کیا گیا ہے، اور عطف تسویہ پیدا کر رہا ہے، پس اولوالامر ایسا ہونا چاہیئے جس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہو۔ سلاطین و امراء کو یہ منصب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟ حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن و سنت قانون ہے لیکن قانون بالکل بیکار ہے اگر کوئی قوت نافذہ نہ ہو یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت۔ اور ظاہر ہے کہ جو قوتِ نافذہ ہو گی، اس کی اطاعت عین قوت مقننہ کی اطاعت ہو گی۔ ایک دہقانی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت عین پادشاہ کی اطاعت ہے۔ بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین قانون اور بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور اس سے مقابلہ کرنا عین قانون اور پادشاہ سے بغاوت کرنا۔ یہ ساری

شرح حدیث حارث اشعری

احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارے میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں، اور عہدِ صحابہ سے لے کر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ وحفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہو گی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم: انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ والسمع والطاعۃ، والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع، ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جثی جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ وان صام وصلی؟ قال وان صلی و صام وزعم انہ مسلم اخرجہ احمد والحاکم من حدیث" الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین قال ابن کثیر ھذا حدیث حسن ولہ الشواھد

یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لیے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے

اطاعت جو مطلوب ہے وہ اللہ کی ہے اور رسول کی ہے۔ یعنی کتاب و سنت کی، اور اولی الامر کی اطاعت صرف اسی لیے ہے تاکہ کتاب و سنت کی اطاعت کی جائے۔ بالاستقلال نہیں ہے۔ پھر فان تنازعتم کہہ کر اور زیادہ واضح کر دیا کہ اگر اولوالامر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے تو پھر اس حکم میں اس کی اطاعت نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ہی کے حکم کی طرف لوٹنا چاہیے۔ قالہ الطیبی فی الشرح

بعض امراء بنو امیہ نے اپنے مظالم و بدعات کی اطاعت کرانے کے لیے جب اس آیت سے استدلال کیا اور کہا الیس اللہ امرکم ان تطیعونا فی قولہ و اولی الامر منکم، کیا خدا نے تم لوگوں کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے کہ اولی الامر منکم؟ کو بعض آئمہ تابعین نے کیا خوب جواب دیا "الیس قد نزعت عنکم بقولہ فان تنازعتم"؟ ہاں مگر پھر اس منصب سے تم محروم بھی تو کر دیے گئے جب فرمایا کہ "فان تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہ والرسول۔

غرضیکہ اس آیتِ کریمہ میں قرآن نے اس قانونِ شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پہ فرض ہے اور اسی کا وجود نظام جماعت کا مرکزی اقتدار ہے۔

انجام پائیں۔ کسی گوشۂ عمل میں بھی پھوٹ کر بیگانگی نہ ہو۔

"ائتلاف" کا مرتبہ "اتحاد" سے بلند تر ہے "اتحاد" صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن "ائتلاف" سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے، وہی جگہ اُسے ملی ہو۔ اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے۔ جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ مثلاً زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جاتے، اور عمرو کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزوِ جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دے دیا جائے۔

"امتزاج" ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کرسکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہمد گر میل نہیں کھا سکتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ۔ لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں، باہم مل کر ایک جان نہ ہو جائیں اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ باہمد گر مل کر ایک

دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں۔ اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

اس حدیث میں پانچ باتیں بتائی ہیں:

(۱) پہلی چیز "جماعت" ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چل کر کثرت سے وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی "جماعت" ہے۔

"جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، امتزاج اور تنظیم ہو۔

"اتحاد" سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمالِ حیات میں منتشر نہ ہوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر

ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کے لیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں تو چاہیئے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کر لیا جائے۔

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلا دیا گیا۔ کیونکہ نماز ہی وہ عملِ عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سینکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں، مختلف شکلوں، اور مختلف لباسوں میں آتے ہیں، لیکن یکایک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزاء کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوتے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوتے سب کے قدم ایک ہی سیدھ میں، سب کے چہرے ایک ہی جانب قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں۔ جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بیک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد و ممزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم۔ پھر دیکھو سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے۔ جس کے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال و افعال کی باگ ہوتی ہے جب چاہے سب کو جھکا دے۔ جب چاہے سب کو اٹھا دے۔

نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں۔ اسی طرح افرادِ انسانی کو بھی اس لیے پیدا کیا تاکہ ان سے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ "جماعت" ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا محض ایک مثنیٰ ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا "امتزاج" کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو، یہ نگینہ اسی انگشتری کے لیے تھا۔

"نظم" سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تفویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود، اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور متألف ممتزج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک "امام" کا وجود ناگزیر ہوا۔ اور اسی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کریں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور اڑتے ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کر دینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے اور پھر ہر ملک ہر آبادی، ہر گروہ میں اس کے

الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی: انی مھاجر الی ربی اور انی ذاھب الی ربی چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال مال و متاع، دوست و احباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے۔ اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے۔ اس لیے ترکِ وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی اور زیادہ تر مہاجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر کیا گیا۔" ولکل امرئ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ و من کانت ھجرتہ لدنیا یصیبھا، اوامرأۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (بخاری عن عمر) یعنی ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی، اور جس نے اس لیے گھر چھوڑا کہ دنیا کمائے، یا نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہوئی جس کے لیے اس نے گھر چھوڑا۔ پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب بعضھا فوق بعض کتاب و سنت اس کی تفصیل سے لبریز ہیں۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

پانچویں چیز "جہاد فی سبیل اللہ" ہے "جہاد" سے مراد ہے جس کے معنی استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو ظاھراً و باطناً ہیں (مفردات راغب)، یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کے لیے انتہا درجہ کی کوشش کرنا یہ کوشش زبان سے بھی

اسلام کی زبان میں "جماعت" سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبوہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔

جماعت کے جن اوصاف و خواص کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ تمام تر قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن شواہد کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۲) دوسری چیز "السمع" ہے یعنی امام جو احکام دے اس کو سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔ "سمع" کے لفظ میں قبولیت احکام، طلب و تعلیم، دونوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز "اطاعت" ہے یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں کہ انما الطاعة فی المعروف

(۴) چوتھی بات "ہجرت" ہے۔ ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ "الهجر والهجران مفارقة الانسان غيره اما بالبدن او باللسان او بالقلب والمهاجرة مصارمة الغير و متاركته (مفردات) اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنی دنیوی تعلقات و مالوفات ترک کر دے۔ مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز و اقربا کے قرب کو، وطن و مکان کو، تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب

اختلاف مسمیٰ میں نہیں صرف اسم میں ہے ایک شخص شب و روز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے۔ لیکن اپنی اصطلاح و رسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلافات سے لے کر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر و اسماء کے تمام پردے اٹھا دیئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں، اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے۔ اگرچہ بھیس مختلف ہیں اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں۔

عبارا تنا شتی وحسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر

علوم و حقائق کے مشاہد و مناظر میں یہ مشہد سب سے اعلیٰ و ارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ "علم الجمع بین المختلفات" سے تعبیر کرتے ہیں[1] اور عامۂ اصحاب اشارات و سلوک نے "مشہد وحدت" کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کے لیے کشف

---

[1] تفہیمات میں لکھتے ہیں: لما تممت بی دورۃ الحکمۃ ما لبسنی اللہ خلعۃ المجددیۃ فعلمت علم الجمع بین المختلفات

ہوتی ہے، مال سے بھی ہوتی ہے، جان سے بھی ہوتی ہے، جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ وجاھدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السنتکم (رواہ ابوداؤد، واحمد ونسائی و ابن حبان عن انس)

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء و قیام کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بھی بغیر جماعت، اطاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکے گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے۔ غور کرو گے تو وہ سب ان ہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔

دنیا کے تمام نزاعات و اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشۂ عمل میں حقیقت و مسمیٰ کے اعتبار سے ایک ہی ہے، لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے اور گو سب طلب گار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم گر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد۔ دوسرا کہتا ہے عسل، مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے

صاف اور سیدھے سادھے معنی بجز ہو سکتے ہیں، صرف انہیں پر غور کر لو۔ سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم تک فوج، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ "جماعت" اور "التزام جماعت" وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے۔ اگر اس کا نظام نہ ہو اور کوئی سردار اور راہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو، تو سب سے پہلے ایک پریزیڈنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لیں گے یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکے گی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے اس کی اطاعت ماتحتوں کے لیے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں؟ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو بھی دیکھو خود تمہارا گھر بھی تو ایک چھوٹی سی آبادی ہے؟ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو؟ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں، تو تم کیوں لڑتے ہو؟ تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں، روز خانہ جنگی ہوتی ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ "الجماعۃ والسمع والطاعۃ" کوئی جماعت امن و نظم نہیں پا سکتی جب تک اُس کا کوئی

حجب اور سیر حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوت نظر و فکر ہے جو ظاہر سے گذر کر حقیقت تک پہنچ جائے، اور اسماء و تعبیرات کے اختلافات دُور کر کے مقاصد و معانی کا اتحاد معلوم کرے۔ بجذ یکہ سارے نزاعات و اختلافات دور ہو جائیں، اور سخت سے سخت متنازع اور متضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل مطلوب دونوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کرو گے تو واضح ہو جائے گا کہ جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد، دنیا کی وہ عالمگیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فردِ بشر کو انکار نہیں ہو سکتا دنیا میں کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو ہر عقل نے ان کا اقرار کیا، ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے، اور ہر عامل جماعت شب و روز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے ان کو تعبیر کیا ہے ان سے زیادہ دنیا کو اختلاف ہے لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی، اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز "جماعت" ہے جس کی مختصر تشریح اوپر گذر چکی ہے غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جس کو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جا سکتا ہے، جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو۔

ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، چپر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کج نظری چھوڑ دو۔ تو معلوم کر لوگے کہ صرف عمل ہجرت کے۔ اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کر جاتے، اپنی ساری خواہشوں اور ولولوں کو ترک نہ کر دیتے۔ گھر کے عیش، اہل و عیال کی محبت، خویش و بیگانہ کی الفت، اور ملک و وطن کی دامنگیریوں سے بالکل آزاد ہو کر راہِ ہجرت میں قدم نہ اُٹھاتے تو آج دُنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پشت پر نظر نہ آتی۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی۔ اگر ولولہ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا، کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں، دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چھان مارا ہے جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویہ واشیاء کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے۔ اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گوارا نہ کر لیتے تو اشیاء کی تخلیق کیونکر ہوتی؟ پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتیں جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہو

امیر نہ ہو، اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے۔ گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ تم گھر کے بڑے ہو یعنی امیر ہو۔ پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہنے پر چلیں۔

"ہجرت" کا لفظ کس قدر تمہارے لیے ناآشنا اور نامانوس ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر لیا تھا، اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا۔ لیکن تبلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں، وہ "ہجرت" کی حقیقت سے کب خالی ہیں اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرۂ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ "ہجرت" سے مقصود ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں، کم تر فوائد کو قربان کر دینا اور حصولِ مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا پھر تبلاؤ علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبے کے حل سکتی ہے؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی تبلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گزرے اس نے پالی ہو۔ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز، انکشافات، انقلاب انگیز،

پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ و قتال میں
مبتلا رکھتا ہے۔ لیکن نو آبادیوں کے اصول کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ ترکِ وطن
کرکے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا، اور قومی دولت و طاقت کو بڑھانے
کے لیے دنیا میں دُور دُور تک پھیل جانا۔ اب غور کرو یہ وہی "ہجرت" اور ترکِ
وطن کی بات ہوئی یا نہیں؟ اور "الجماعۃ والسمع والطاعۃ والہجرۃ" پر دنیا
عمل کر رہی ہے یا نہیں؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے۔

جہاد کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و
محنت کرنا، کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی
خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و
قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا جس چیز کو
تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء و قیام کی
اصلی بنیاد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے اگر
تم سے ڈارون اور رسل ویلیس تنازع للبقا — STRUGGLEFOREXISTEN
CE — اور انتخاب طبیعی EXL NATURAL اور بقائے اصلح SYRV
کا ذکر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس کارزار IYAL OFTAEFNTSBT
حیات میں بقا صرف اصلح و امثل کے لیے ہے، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو
اور فطرت کے قتل و غارت کا افسانۂ خونیں تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا۔ لیکن اسی حقیقت کو قرآن
و اسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ جو قانون الٰہی زمین کے کیڑوں مکوڑوں
تک پر نافذ ہے۔ اس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے؟

سکتیں؟ نئی نئی ایجادات اور انکشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا، تو آج دنیا کا نصف تمدّن ناپید تھا۔ یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی سربفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا۔ اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت ان کے گھروں میں کھنچ کر نہ جاتی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان ہو جائیں۔ تو تم کہو کہ یہ تحقیقِ علم کا کمال اور جذبۂ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ "ہجرت" سے تعبیر کرے، تو تم اس کا انکار کر دو۔ تمہارے نزدیک یہ تو تمدّن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں، لیکن یہ وحشت ہے کہ قیامِ حق اور اشاعتِ صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترکِ وطن کریں؟ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ "کششِ ثقل" کا قانون دریافت کر لے تو تم اس کی پرستش کرو اور کہو کہ یہ علم پرستی ہے۔ لیکن اگر تم عزم و طلب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اس عازمِ صادق کے لیے کیا کہتے ہو، جو قانونِ کششِ ثقل کے لیے نہیں بلکہ قانونِ نجاتِ عالم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے۔

آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد کالونیل سسٹم کو یقین کرتا ہے۔ یعنی نو آبادیوں کے اصول کو، اور اس کا اس درجہ

تفرقہ اور باہم دگر علیحدگی، اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہوتا، اسلام نے ظاہر ہوکر زندگی کی جو تخم ریزی کی، وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و ائتلاف، تمام منتشر افراد کو ایک متحدہ جماعت بناکر نفس واحد کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیئے۔ واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا الخ

پس جاہلیۃ کا دوسرا نام تفرقہ ہوا، اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہوگیا۔ گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ مزید احادیث میں بعض روایات صحاح یہ ہیں:

"من اطاعنی فقد اطاع اللہ، ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصیٰ امیری فقد عصانی۔" (صحیحین عن ابی ہریرۃ) جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میرے امیر کی (یعنی میرے نائب کی) اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی اور جس نے امیر سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے انکار کیا یعنی امیرالمؤمنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں "میری" کی جگہ صرف "الامیر" ہے۔ یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو۔ س

پس دنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیئے جو حق وہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیئے اور قانونِ الٰہی کا ہاتھ بن کر مٹا دینا چاہیئے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں لیظھرہ علی الدین کلہ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانونِ ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارت گری کی وحشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نوآبادیوں سے بھر دیں اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں۔ اس کو تو تم گوارا کر لو، لیکن اگر اسلام کہے کہ: "ان الارض للہ و رسولہ" خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں ہے تو تم اس کو وحشت اور خوفناکی کہو؟

جماعت و التزامِ جماعت

یہاں ایک اور اہم اور قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث (حدیث حارث اشعری) اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے برعکس کو جاہلیت جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ

(اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گذرا ہے، اس کو عہدِ جاہلیت کہتے ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیت کی طرح گمراہی پر موت ہوئی) دوسری روایت میں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اُسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر کرے اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو، کیونکہ جو کوئی سلطانِ اسلام کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہُوا اور اسی حالت میں مر گیا۔ تو اس کی موت جاہلیت کی حالت پر ہوتی۔ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے: "من خلع یدا من طاعة لقی الله یوم القیٰمة ولا حجة له ومن مات ولیس فی عنقه بیعة، مات میتة جاهلیة جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا، یعنی اطاعت نہ کی، تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی بیعت و اطاعت کے حلقہ سے اس کی گردن خالی ہوئی تو یقین کرو کہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

"من فارق الجماعة شبرا فكانما خلع ربقة الاسلام من عنقه (ترمذی) جو جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ ایک روایت میں ہے" دخل النار اخرجه الحاکم علی شرط الصحیحین یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

کی اطاعت۔

"اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ" (صحیحین عن انس) اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے، تو چاہیئے کہ اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے خطبوں میں آپ فرماتے تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت مروی ہے ۔ حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقع پر (جبکہ دو تین ماہ کے بعد) آپ دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے اور ایک آخری اور وداعی پیام دنیا کو سنا رہے تھے" فرمایا "ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا و اطیعوا" (مسلم) اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے، تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

"من خرج من الطاعۃ و فارق الجماعۃ، فمات، مات میتۃ جاہلیۃ" وعن ابن عباس من رأی من امیرہ شیئا یکرھہ، فلیصبر فانہ من فارق الجماعۃ شبرا فمات، فمیتۃ میتۃ الجاہلیۃ" وفی لفظ "فانہ لیس احد من الناس خرج من السلطان شبرا فمات علیہ الا مات میتۃ جاہلیۃ" (متفق علیہ) یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مرگیا۔ تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی

معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شرائطِ امامت و خلافت کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں اور قدرتی طور پر یہی دو صورتیں اس مسئلہ کی ہو سکتی تھیں۔

اسلام نے اس بارے میں نظامِ عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب کا حق امت کو ہے اور طریقِ انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی و نسلی۔ یعنی قوم اور قوم کی صائب الرائے جماعت (اہل حل و عقد) کو شرائط و مقاصد خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیئے۔ بحکم وامرھم شوریٰ بینھم بنیاد تمام امور کی شرعًا شوریٰ یعنی باہمی مشورہ ہے نہ کہ نسل و خاندان، خلافتِ راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا۔ خلیفۂ اوّل کا انتخاب عام جماعت میں ہوا خلیفۂ دوم کو خلیفۂ اوّل نے نامزد کیا اور اہل حل و عقد نے منظور کر لیا۔ خلیفۂ سوم کا انتخاب جماعتِ شوریٰ نے کیا۔ خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ نسل، خاندان، ولی عہدی کو اس میں کوئی دخل نہ تھا اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفۂ اول کے خاندان میں آجاتی، یا دوم و سوم کے خاندان میں، مگر ایسا نہیں ہوا۔ خلیفۂ دوم نے تو قوم کو بھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان کے لڑکے کو خلیفہ منتخب کرے وصیت کر دی کہ وہ کسی طرح منتخب ہی نہیں ہو سکتا۔

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظامِ شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے، اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ملے، تو کیسا شخص منتخب کرنا چاہیئے؟ اور اس میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہئیں؟

کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلك نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون۔ قالوا انما تامرنا قال فوا ببیعۃ الاول فالاول، ثم اعطوھم حقھم، فان اللہ یسائلھم عما استرعاھم (متفق علیہ) بنی اسرائیل کی رہنمائی وریاست انبیاء کرتے تھے ایک نبی گیا تو دوسرا اس کی جگہ مامور ہوا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ البتہ خلفاء ہوں گے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم کو ان کی نسبت کیا حکم ہوتا ہے؟ فرمایا جس سے پہلے بیعت کی، یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی گئی، اس کی اطاعت مقدم ہے۔ پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو۔ اور فرمایا ان کا تم پر جو کچھ حق ہے، وہ ان کے حوالے کرو۔ یعنی ان کی اطاعت کرو۔ زکوٰۃ وخراج وغیرہ انہی کو دو۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں۔ اجماع کے شواہد اور کتب عقائد وفقہ کے اقوال نقل نہیں کیے گئے کہ مشہور ومعروف ہیں اور احادیث کے بعد ان کی ضرورت بھی نہیں۔

شرائطِ امامت وخلافت

تمام نصوص ودلائل کتاب وسنت اور اجماع امت پر غور کرنے سے

اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا، مگر دوسری صورت میں قولاً وفعلاً سب متفق ہوگئے۔

پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کی وہ تمام شرائط اپنے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دی ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کے لیے قدرتی طور پر ہونا چاہئیں۔ کیا باعتبار قوت علمی کے، کیا باعتبار قوت عملی کے۔ اور چونکہ یہ منصب متعدد حیثیتوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم و نظر، عمل و تقویٰ، شجاعت و صولت، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ طاقت و شوکت، چنانچہ تمام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آتے ہیں: ویشترط ان یکون من اھل الولایۃ المطلقۃ الکاملۃ بان یکون مسلماً حراً، ذکراً، عاقلاً، بالغا سائسا بقوۃ رائہ ورویتہ، ومعونۃ باسہ وشوکتہ "قادراً بعلمہ وعدالتہ وکفایتہ وشجاعتہ علی تنفیذ الاحکام وحفظ حدود الاسلام وانصاف المظلوم من الظالم عند حد وث المظالم" الخ کذا فی شرح المواقف، والنسفی، والتمھید، وشرح فقہ الاکبر للقاری وشرح المقاصد ومن کتب المحدثین شرح عقیدۃ ابن عقیل وفتح الباری وشرح منظومۃ الآداب وخلاصۃ ابن مفلح، ونیل الاوطار وبلوغ المرام الشوکانی والاقناع وشرحہ وغیرھم یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں۔ مسلمان

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو۔ قوم کی رائے اور انتخاب کو اس میں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تختِ خلافت پر قابض ہو جائے، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟ اگر وہ اہل نہیں ہے، ظالم ہے، جابر ہے، شرائطِ خلافت اس میں نہیں پائے جاتے؟ تو اس کی اطاعت کرنی چاہیئے یا اس پر خروج کرنا چاہیئے؟ وہ شرعاً خلیفۃ المسلمین ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے ماتحت وہ تمام کام انجام پا سکتے ہیں یا نہیں جو از روئے شرع خلیفۂ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں؟ اس کو زکوٰۃ دینی چاہیئے؟ اس کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیئے۔ اس کے تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اس کی پوری پوری تشریح و توضیح نہ کر دیتی۔ اس بارے میں نصوص سنت بے شمار اور بالکل واضح ہیں۔ اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تأمل و تذبذب نہ ہوا بالکل اس شخص کی طرح جو پہلے سے ایک خاص وقت کا سمجھا بوجھا منتظر ہو۔ فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ انہوں نے تبلایا اور کیا، اسی پر اجماع امت کی مہر لگ گئی، اور تیرہ سو برس سے جمہور اہلِ اسلام کا وہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پا گیا۔ بلاشبہ پہلی صورت میں بعض

کافی ہے کہ امام سید یعنی بنی فاطمہ میں سے ہو۔

لیکن دوسری صورت میں (یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ و تسلط کی صورت پیدا ہو جائے اور جمہور کو انتخاب و نصب کا موقع نہ ملے، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے سو اس کی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ وعترۃ میں بالکل صاف صاف موجود تھا اس لیے تمام امت بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اس کی حکومت جم جائے، تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفۂ اسلام تسلیم کرے اسی کے سامنے گردن اطاعت جھکائے بالکل اسی طرح جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکنا چاہیئے اطاعت و اعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں خروج اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو جو کوئی ایسا کرے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں۔ وہ شرعاً باغی ہے اس کو قتل کر دینا چاہیئے۔

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا؟ اس کی علت و مصلحت اس قدر واضح ہے کہ شرح و تفصیل کی حاجت نہیں۔ شریعت اور امت کا قائم و باقی رہنا حکومت کے وجود و قیام پر موقوف تھا۔ ساری باتیں شاخ ہیں جڑ یہی مقام و منصب ہے پس اس کے لیے ایک نظام شرعی مقرر کر دیا

ہو آزاد ہو۔ مرد ہو، عاقل و بالغ ہو۔ صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھتا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو۔ ان کے جاری و نافذ کرنے اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کے لیے جس قدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوں ۔ اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و ہمت۔ شوکت و صولت ساری صفتیں ہونی چاہئیں۔

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی، یعنی خلافت خاندان قریش و عرب میں رہی دسنہ ۶۵۶ھ مطابق سنہ ۱۲۵۸ء تک اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک بوجہ بقاء خلافتِ عباسیہ مصر علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بموجب حدیث ان حفاظ الامر فی القریش، خلیفہ کو قریشی بھی ہونا چاہیئے یعنی اگر مسلمان خلیفہ مقرر کریں تو جہاں اور بہت سی باتیں اس میں ہونی چاہئیں، وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو۔

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت آئمہ اہل بیت نبوت کے لیے منصوص ہے۔ ان کے اعتقاد میں آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور ان کے بعد ان کی نسل کے آئمہ عترہ رضی اللہ عنہم کو۔

زیدیہ اس طرف گئے ہیں کہ بنی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت ہیں آئمہ عترہ کی خصوصیت ضروری نہیں۔ اور شرطوں کے ساتھ صرف اس قدر

آپ نے فرمایا: انا لا نولی ھذا من سالہ ولا من حرص علیہ " جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو اس کو میں یہ کام سپرد نہ کروں گا۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب و حرص نہ کریں گے تو کش مکش اور مقابلہ بھی نہ ہوگا، اور امت کے لیے نہایت آسان ہو جاتے گا کہ اہل و اصلح کو منتخب کرے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۴) اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیت اس بارے میں کیا ہے تو پہلا باب اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کا باندھا۔ اور من اطاع امیری فقد اطاعنی الخ کی روایت درج کرکے تبلادیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے، رسول ہے اور پھر خلیفہ و امام ہے۔ " اولوالحلم " خلیفہ کے سوا کوئی نہیں اس کی اطاعت (بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو) مثل خدا و رسول کی اطاعت کے فرض ہے۔ پھر باب باندھا " الامراء من قریش " اور اس میں ابن جبیر والی روایت لاتے۔ " ما اقاموا الدین " جب تک قریش میں دین قائم رکھنے کی اہلیت رہے گی، خلافت بھی انہی میں رہے گی۔ یعنی واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قرشی خلافت کی پہلے سے خبر دے دی گئی ہے مگر خلیفہ کا قرشی ہونا کوئی شرط اصلی و تشریعی نہیں۔ صرف پیش گوئی ہے اور اقاموا الدین کے ساتھ مشروط۔ اس کے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوتے اور باب باندھا اجر من قضی بالحکمۃ " افسوس اس باب

گیا جو ہنر سے بہتر نظام ہو سکتا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوریٰ کے انتخاب پر رکھی۔ شخص، نسل، تسلط، اقتدار اور پادشاہی وملوکی کو اس میں دخل نہیں۔ ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کے لیے تمام ضروری شرطیں اور صفتیں بھی تبلادیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اس کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر پورے زور کے ساتھ اس کا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت وسرداری حاصل کرنے کا خواہش مند نہ ہونا چاہیئے۔ نہ دعویٰ دار بن کر دوسروں سے لڑنا چاہیئے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لیتے لا ینازع الامر اھلہ سرداری کا جو اہل ہو گا، اسی پر سرداری چھوڑیں گے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملہ پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے۔ "مایکرہ من الحرص علی الامارۃ"[1] اور ابو موسیٰ کی روایت لائے ہیں جس میں

---

[1] حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح وتفسیر کا قرض اب تک امت کے ذمہ باقی ہے۔ بیشمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی یہ قول ویسا ہی صحیح ہے جیسا کہ ابن خلدون کے عہد میں تھا۔ اس کتاب کے علوم ودقائق کا کوئی احاطہ نہ کر سکا۔ ہر کتاب، ہر باب، ابواب کی ہر ترتیب، اور ہر ہر عنوان وترجمہ، اس فقیہ الارض واعجوبۃ الدھر کی فقاہت ربانی کی آیت باہر وحجت قاہرہ ہے۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ، اور دیکھو، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں

یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں، اس لیے شرع وملت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ نظامِ اصلی پر زور دینے کے ساتھ ان

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۶) سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے کہ خلیفہ اہل ہو یا نا اہل، جامع الشروط ہو یا فاقد الشروط، عادل ہو یا جابر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے، نماز قائم کرتا ہے اُس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ کسی مسلمان کے لیے اس کی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں اس کے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں من لم یسأل اللہ اعانہ اللہ دوسرا من سأل الامارۃ وکل الیھا۔ تیسرا ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ۔" حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے امت کو خلیفہ امام کی ضروری صفتیں اور شرطیں تبلادی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت وسرداری کا خواہاں ہو اور اُس کے لیے مقابلہ کرے، حتیٰ کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ سے کہا: جو اہل اور احق ہو اور اسی کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگرچہ اس کے لیے قسم بھی توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے۔" پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظامِ شرعی کی اصلی ترتیب یہ ہے۔

(الف) امت کے لیے حسب نص "و اولی الامر منکم" مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہے۔

(ب) خبر دے دی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہے گی

مسئلہ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ تھا۔ اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن وسکون کی بہشت بن جائے۔ لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵) کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھے۔ منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آئی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے اور اس کا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اس کی طریق "حکمت" پر ہے۔ یعنی انبیائے کرام کے طریق، تربیتِ امم پر جو "سنت" کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے اور جس کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں "حکمت" سے تعبیر کرتا ہے۔ ترجمۂ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون" حکم وقضا ما انزل اللہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اگر خلاف ہو تو فسق ہے" ما انزل اللہ" کتاب و سنت ہے یعلمھم الکتاب والحکمۃ" پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد منہاج نبوت پر ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں جو واضح ومفصل احادیث تھیں، وہ چونکہ ان کی شروط کے مطابق نہیں لی جاسکتی تھیں اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں اس لیے آثار وموقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے۔ پس مشہور حدیث لاحسد الا فی اثنتین الخ درج کرکے قضا بالحکمت کی اہمیت ومطلوبیت واضح کردی۔ جب یہ مقدمات طے ہوچکے تو اب دکھلانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کردی گئی ہے! پس باب باندھا السمع والطاعۃ الامام مالم تکن معصیۃ " اُمّت کا

جمہوری حکومت کی جگہ شخصی واستبدادی طریقہ قائم ہو جاتے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت، جان و مال کا امن، ممالک اسلامیہ کی حفاظت، احکام شرع کا اجرا، جماعت کا قیام و بقا اور اسی طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور مزید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سد باب ہو جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر شرعی نظام کے قائم ہو جانے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

لیکن اگر خلافت تسلیم نہ کی جائے، ان پر خروج کرنے کی اجازت دے دی جائے اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشروط خلیفہ ہی کو قرار دیا جائے، تو پھر دائمی کشت دخون، جنگ و قتال، دعووں میں تصادم قوتوں میں تزاحم، ہمیشگی کی بدامنی، کبھی نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی اور انارکی، امت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال کی بدامنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بے شمار

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۸) ہوا اور تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے چنانچہ پہلے ہی سے اس کی خبر دے دی گئی تھی۔

وقتوں کے لیے بھی صاف صاف احکام دے دیئے جائیں جب انتخاب و نصب خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹھہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۷) خلافت پر قابض رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(ج) بنیاد معاملۂ خلافت کی "حکمت" پر ہے وہ حکمت کہ **و یعلمھم الکتب والحکمۃ** یہ نیابت و نبوت ہے اور اعمال و سنت نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "حکمت" ہے۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد سنت پر ہو۔ بدعت و احداث پر نہ ہو۔ یہی معنی خلافت **علیٰ منہاج النبوۃ** ہیں۔

(د) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اس کی اطاعت فرض ہے **فی ما احب و یکرہ۔ مالم یومن بمعصیۃ**

(ہ) امت کو چاہیئے کہ احق و اہل کو منتخب کرے۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیئے کہ خود خلافت کی خواہش کرے۔ جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے اور حق انتخاب جمہور کو ہے تو کسی طرح بھی کش مکش نہ ہو گی۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہو گا۔ امن و سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائے گا۔

یہ تھا صحیح نظامِ شرعی، جس کے علم و فہم کے لیے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جس کے لیے صحیح بخاری کافی نہیں، لیکن افسوس کہ نظامِ شرعی قائم نہ رہا۔ مجلس شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ

زکوٰۃ کس کو دی جاتی ؟ جمعہ کون قائم رکھتا ؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا ؟ تمام عالم اسلام ایک دائمی خانہ جنگی و بدامنی میں مبتلا ہو جاتا۔ امن و نظم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا۔ دشمنانِ اسلام ہر طرف سے امنڈ آتے۔ ان کو روکنے کے لیے کوئی طاقت موجود نہ ہوتی۔ پس اگرچہ ایک نااہل مسلمان کا خلیفہ ہو جانا بُرائی ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر بُرائی یہ ہے کہ تمام ملک برباد ہو جائے۔ اسلام نے ملک و شرع کی حفاظت کو مقدم رکھا، جو کلی مصلحت کا حکم رکھتی ہے اور نااہل و فاقد الشروط کا تسلط گوارا کر لیا۔ جس کا فساد جزئی فساد ہے۔

نصوصِ سُنّت و اجماعِ اُمّت

•

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اگر داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی، تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ آنے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اوّل روز ہی بتلا دی گئیں ؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا گیا ؟ یہ معاملہ اس قدر یقینی اور ہر طرح کے

ہلاکتوں اور بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نااہلوں کی جگہ کسی اہل اور جامع الشروط کو خلافت دلائی جاسکے۔

پہلی صورت میں مصلحت کا بقاء وحصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔ دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالح کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی، اور پوری قوت واصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کر دی۔ یعنی مصالح کے امکان پر ان کے وقوع کو ترجیح دی۔

کیا دنیا میں ایک عقل صحیح بھی ایسی مل سکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتائے۔ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالح اور دفع مفاسد ہے یعنی ہمیشہ فوائد حاصل کرنا اور مفاسد کو دور کرنا۔ اور جب مصالح کے ساتھ مفاسد بھی جمع ہو جائیں، تو جس راہ میں مصالح زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اسی کو اختیار کرنا، تمام احکام کا محور یہی اصل ہے۔ پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کے لیے خلیفہ کا جامع الشروط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دے دیا جاتا، تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا؟ نصب و انتخاب کے لیے نظام شرعی درھم برھم ہو چکا تھا۔ ہر دماغ میں حرص و دعوی، اور ہر ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف الملوکی اور انارکی پھیل جاتی۔ ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل و مستحق نہیں ہے بغاوت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تمام امت میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی۔ شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا۔ آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا۔ نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا، نہ ڈاکوؤں سے کوئی بچانے والا

فقال علیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان کان عبدا حبشیاً
وسترون من بعدی اختلافا شدیدا فعلیکم بسنتی و
سنۃ خلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ
(ابن ماجہ وترمذی) اور حدیث خیرالقرون قرنی ثم یلونھم الخ
اور اما طبقتی وطبقۃ اصحابی فاھل علم و ایمان" الخ رواہ
البغوی عن انس وامثالھا، اسی قسم میں داخل ہیں۔

خلاصہ ان کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور
فرمایا۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سنو
اور مانو اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو! میرے بعد بڑے سخت اختلافات
پڑنے والے ہیں پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور
میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کاربند رہو اور اس کو اس طرح مضبوطی
سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانتوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے۔ اور فرمایا
بہتر زمانہ میرا ہے، پھر وہ جو میرے بعد کا ہے اور فرمایا: میرا اور میرے
یاروں کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کی حدیث
ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی الا کان لہ حواریون
واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ الخ (مسلم) میں بھی اسی
عہدِ خلافت کا ذکر کیا گیا ہے۔

غرضیکہ اس سے پہلے دَور کے لیے دو حکم دیئے گئے ایک اطاعت

شک وشبہ سے ماوراء ہے، کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کے لیے تیار نہیں تو دنیا کے پاس ماضی کی جس قدر معلومات موجود ہیں ان میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں ہوسکتی۔ نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی بادشا گذرا نہ روما نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی، نہ ہم بیسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ نپولین کا وجود اور واٹر لو کی جنگ کا وقوع تسلیم کرلیں۔

بہرحال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پیشتر سے معلوم تھے۔ ہر حالت میں اور ہر وقت کے لیے صاف صاف حکم دے دیا گیا تھا۔ احادیث کے اس حصّہ کا نہایت دقّت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہر دور کی خاص حالت ہے اور اسی لیے اسی کے مطابق خاص حکم ہے۔

سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں۔ جن میں خلافت خاصّہ و راشدہ کا ذکر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ خلافت ٹھیک ٹھیک طریق نبوت و سنت پر قائم ہونے والی تھی۔ اس لیے امت کو وصیّت کی ہے کہ نہ صرف اُن کی اطاعت کی جائے بلکہ ان کے تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثل اعمالِ نبوت کے "سنت" سمجھا جاتے اور اُس کی پوری طرح پیروی و اطاعت کی جائے۔

چنانچہ مشہور حدیث عرباض بن ساریہ" قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم فوعظنا موعظۃ بلیغۃ، وجلت منھا القلوب، و ذرفت منھا العیون فقیل یا رسول اللہ! وعظتنا موعظۃ مودع فاعھد الینا بعھد

عن عبادة بن الصامت قال" بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فی منشطنا ومکرهنا وعسرنا ویسرنا واثرة علینا وان لاننازع الامر اهله، الا ان تروکفرا بواحا عندکم فیه من الله برهان" (متفق علیہ) عبادہ بن صامت کہتے ہیں۔ ہم سے رسول اللہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۴) اور لوگوں کا ذکر ہے اس لیے احکام بھی مختلف ہوئے۔ اس نکتہ پر جس کی نظر نہ گئی وہ احکام و علائم کو مختلف و متضاد دیکھ کر یا تو حیران رہ گیا۔ یا سخت غلطیوں سے دوچار ہوا۔ عہدِ نبوت سے لے کر آخر تک مختلف دَور آنے والے تھے، ہر دور کے خصائص و حالات دوسرے سے مختلف تھے۔ پس ان کے احکام میں بھی اختلاف ضروری تھا۔ پوری دقت نظر کے ساتھ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ پہلے ان کے باہمی مشترکات، و مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیئے۔ پھر ہر حدیث اور حکم کو اس کی صحیح جگہ دینی چاہیئے ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ "اطاعت" اور "اقتدار" کا فرق نہ سمجھے۔ جن حدیثوں میں اقتدار کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا۔ اُن کو منع اطاعت اور جواز خروج پر محمول کر لیا۔ خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہُوا۔ ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام مطلق سمجھ لیا اور منع اقتدار و تاسّی اور وجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی۔ وُہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء و حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ خواہ ان کے اعمال کیسے ہی خراب

کا، دوسرا اقتدار اور پیروی کا۔

لیکن اس کے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں، جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دَور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہا لیکن دوسرا حکم بالکل بدل گیا۔ یعنی اس دور کے خلفاء وسلاطین کی اطاعت کی تو ویسی ہی وصیت کی جاتی ہے۔ جیسے پہلے دَور کے لیے کی گئی ہے۔ لیکن ان کے کاموں کی پیروی اور اقتدار کا حکم نہیں دیا جاتا۔ بلکہ بتدریج ترک اقتدار ومخالفت کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ خلافت پر قابض ومسلط ہوں گے، ان کی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہو گی۔ نہ ان کا چلن قرآن وسنت کے مطابق ہو گا۔ ان میں اچھے بھی ہوں گے اور بُرے بھی اس لیے امت کو اب صرف اطاعت کا اور ان کی خلافت کے آگے سر جُھکا دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے اور ان کے کاموں کو شرعی کام سمجھ لینے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس بات کی بھی وصیت کی جاتی ہے کہ جب وُہ لوگ بُرائیاں پھیلائیں تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے بُرائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے۔ ہاتھ سے کام لے۔ زبان کو حرکت میں لائے۔ یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں کو کم از کم دل ہی دل میں بُرائی کو بُرا سمجھے "و ذالك اضعف الایمان" لیکن بُرے کاموں کو ان کی حکومت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ ان کا ساتھ دے ولیس وراء ذالك من الایمان حبۃ خردل[1]

---

[1] احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ مختلف حدیثوں میں مختلف دوروں

دیں گے اور کبھی اس بارے میں کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ اِلّا یہ کہ بالکل کھلا کھلا کفر امام سے ظاہر ہو اور ایسی بات میں جس کے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے۔ سو اس وقت کسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے نہ روک سکے گی۔ یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ سرزد ہو، ہر حال میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۶) پیشوا مان لینا اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اُس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنا لینا اور اُس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرنا اس کا نام "اقتدار" اور "تاسّی" ہے۔

دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ "اطاعت" ایک عام حالت ہے اور اس میں "اقتدار" کی حالت بھی داخل ہے۔ لیکن "اقتدار" اطاعت سے زیادہ خاص ہے، اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اقتدار بھی ہو۔ احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو "اطاعت" اور "اقتدار" دونوں کا حکم دیا گیا۔ لیکن بعد کے خلفاء و سلاطین کو صرف "اطاعت" کا مستحق بتلا دیا۔ "اقتدار" کا نہیں کیونکہ معلوم تھا کہ ان کے کام اچھے نہ ہوں گے۔ شریعت و عدالت سے منحرف ہو جائیں گے اور چونکہ نظامِ جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب و سنت اور عدل و صداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا، اس لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا۔ یعنی حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطانِ اسلام کو اپنا امام مان کر پوری پوری اطاعت کرو، لیکن

(صلعم) نے اس بات پر بیعت لی کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کریں گے۔ حکومت و سرداری کو اس کے کرنے والوں پر چھوڑ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۵) ہوں تو پھر چاہیئے کہ نہ کسی برائی پر ٹوکیں، نہ منکرات کے خلاف جدجہد کریں۔ ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں۔ یہ جو صدیوں سے علماء و مشائخ نے ارباب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یک قلم ترک کر دیا ہے تو نفس خادع ان کو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ ان لوگوں نے چونکہ "اطاعت" اور "اقتدار" کا فرق نہیں سمجھا، اور دیکھا کہ بادشاہوں اور امیروں کو برائی پر ٹوکنے اور ان کے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ یہی مصائب فتنہ ہیں پس اس فتنہ سے بچنا چاہیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ تمام زبانیں گونگی اور تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے۔

حالانکہ دونوں جماعتوں نے ٹھوکر کھائی۔ دونوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا۔

ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی بادشاہ مان لیں اور ایک بادشاہ کی جیسی فرمانبرداری رعایا کو کرنی چاہیئے ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرمانبرداری بجا لائیں کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے۔ اس کا نام "اطاعت" ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں

وعن حذیفة انه (صلعم) قال یکون بعدی ائمة لا یهتدون بهدیٰ ولا یستنون بسنّتی وسیقوم فیکم رجال قلوبهم قلوب الشیاطین فی جسمان انس۔ قال قلت "کیف اصنع یارسول اللّٰہ ان ادرکت ذالک" قال تسمع وتطیع وان ضرب ظهرک واخذ مالک فاسمع واطع" رواہ مسلم واحمد۔

یعنی فرمایا تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ ان کی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری ان کے دلوں میں۔ تمہاری زبانوں سے ان کے لیے رحمت کی دعا نکلے اور ان کی زبانوں سے تمہارے لیے اور بدترین حاکم وُہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کی دشمنی ہو اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں۔ تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھگڑیں۔ فرمایا نہیں۔ جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں، ان کی اطاعت ہی کرو۔ ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اُسے پسند نہ کرو۔ مگر امام کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔ نیز فرمایا میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرا طور طریقہ چھوڑ دیں گے۔ میری سنت پر نہیں چلیں گے۔ عنقریب تم پر ایسے لوگ حکمران ہوں گے کہ ان کا جسم تو انسانوں کا ہوگا۔ مگر دل شیطان کا سا۔ راوی نے پوچھا۔ اگر ہم نے ایسا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۸) بنیاد پر قائم رہے، ولو اتبع الحق اهواء هم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیهن

خیار أئمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم، وتصلون علیهم و یصلون علیکم وشرار أئمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم" قال قلنا أفلا ننابذهم عند ذلک؟ قال "لا" ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ الامن ولی علیہ والٍ فراٰہ شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یداً من طاعتہ، رواہ احمد ومسلم

(بقیہ نوٹ صفحہ ۸۷) پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ اور دن کو رات مان لو۔ حق حق ہے اور باطل باطل۔ بُرائی جب دیکھو، ٹوکو۔ ظلم جب کیا جائے روکو، اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور دونوں برابر ہیں لاطاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق "قاعدہ کلیہ ہے، اور وتواصوا بالحق و تواصوا بالصبر حکم عام و مطلق۔ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم سے نافرمانی کرنی پڑے۔

اور یہ جو جا بجا کہا گیا کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے تو یاد رہے کہ "اطاعت" نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ نہ کہ اقتدار نہ کرنے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں۔ یعنی خلیفہ اسلام سے بغاوت نہ کرو۔ اس میں جمعیت اُمت کے لیے بڑا ہی فتنہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بُرائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کے لیے نظم و امن ہے وہ کبھی فتنہ نہیں ہوسکتا۔ اور حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی کس

بڑے سے بڑے مخلوق کی خاطر بھی خدا کا چھوٹے سے چھوٹا حکم نہیں ٹالا جا سکتا اور نہ مخلوق کی خاطر خالق سے نافرمانی کی جا سکتی ہے۔ یہ اسلام کا، اور دراصل دنیا کی تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ وغیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت حکم دیا گیا کہ اگرچہ وصول کرنے والے حکام ظالم و جابر ہوں، یا بیت المال کا روپیہ ناجائز طور پر خرچ کر رہے ہوں لیکن اگر امام کی طرف سے مامور ہیں تو ان کی اطاعت ہی کرنی چاہیئے۔ جس شخص نے زکوٰۃ ایسے عامل کو دیدی اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ بلاشبہ قوم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں۔ لیکن جب تک معزول نہ ہوں نظام شریعت و حکومت کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا "ان قوما من اصحاب الصدقة یعتدون علینا عمال صدقہ لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں ان کا مقابلہ کریں؟ فرمایا نہیں (ابو داؤد) سعد بن وقاص کی روایت میں فرمایا "ادفعوا الیهم ما صلوا" ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمرؓ کی نسبت ہے کہ کسی نے کہا۔ زکوٰۃ کسے دیں کہا وقت کے حاکموں کو۔ سائل نے کہا "اذ یتخذون بها ثیابا و طیبا" وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا "وان" اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر زکوٰۃ انہی کو دو۔

اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا ہے "براءة رب المال بالدفع الی السلطان مع العدل والجور۔ کما فی المنتقی۔" یعنی

زمانہ پایا تو کیا کریں؟ فرمایا۔ سنو اور اطاعت کرو۔ اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں۔ جب بھی ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

"ستکون بعدی اثرۃ وامور تنکرونہا۔ قالوا انما تامرنا؟ قال تؤدون الحق الذی علیکم وتسألون اللہ الذی لکم" متفق علیہ فی التلخیص، وعن جابر بن عتیک مرفوعًا عند ابی داؤد بلفظ سیاتیکم رکب مبغضون، فاذا اتوکم فرحبوا بھم وخلوا بینھم وبین ما یبتغون۔ فان اعدلوا فلانفسھم، وان ظلموا فعلیھم

وعن وائل بن حجر۔ قال سمعت رسول اللہ صلعم ورجل یسالہ فقال ارأیت ان کان علینا امراء یمنعونا حقنا ویسألون حقھم قال اسمعوا واطیعوا فانما علیھم ما حملوا، وعلیکم ما حملتم (مسلم والترمذی وصححہ۔

" علی المرء المسلم السمع والطاعۃ فی ما احب وکرہ الا ان یوم بمعصیۃ فان امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ (شیخان وغیرھما عن ابن عمر)

سب کا خلاصہ وہی ہے جو اوپر گذر چکا۔ آخری روایت میں فرمایا: ایک مسلمان کا فرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا ناگوار، مگر امام کا کہنا سُننے اور ماننے ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جس کی تعمیل میں گناہ ہو، تو پھر اس حکم میں نہ تو سننا ہے اور نہ ماننا۔

جماعتكم فاقتلوه" (احمد ومسلم)

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہو یا نا اہل، لیکن اگر اس کی حکومت قائم ہے تو جو اس پر خروج کرے، اس کا حکم باغی کا ہو گا اگرچہ کتنا ہی افضل اور جامع الشروط ہو۔ اس سے لڑنا اور اس کی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ تبلیغ ودعوت اور دفع شکوک کے بعد بھی باز نہ آئے۔ ایک گروہ علماء نے کہا ہے کہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بحکم فقاتلوا التی تبغی (۴۹: ۹) واجب ہے "وقد حکی فی البحر عن العترة جمیعًا ان جهادهم افضل من جهاد الکفار الی دیارهم، اذ فعلهم فی دار الاسلام کفعل الفاحشة فی المسجد." (نیل الاوطار۔ جلد ۷ صفحہ ۸۰) یعنی تمام ائمہ اہل بیت وعترة سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے۔

مصلحت وحکمت اس حکم کی ظاہر ہے۔ اگر اول روز ہی سے دعووں اور خروج کا دروازہ بند نہ کر دیا جاتا تو کوئی بہتر سے بہتر اسلامی حکومت بھی خروج وشورش سے محفوظ نہ رہ سکتی۔ ایک جامع الشروط خلیفہ کی موجودگی میں بھی صدہا دعویدار اُٹھ کھڑے ہوتے اور کہتے کہ جمع الشرائط واہل بیت میں ہم زیادہ احق وافضل ہیں۔ اوصاف وفضائل کا قطعی فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ اور نہ افضل ومفضول کے امتیاز کے لیے کوئی قطعی معیار ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ ہمیشہ کشت وخون کا بازار گرم رہتا اور امت کا نظام جمعیت کبھی نہ سدھرتا۔ پس ناگزیر تھا کہ خلافت قائمہ کی موجودگی میں ہر طرح کے

صاحب مال نے جب اپنی زکوٰۃ عمّال کے حوالے کر دی تو وہ شرعاً بری الذمہ ہو گیا۔ اگرچہ وہ ظالم وجابر ہوں اور اسی لیے جمہور فقہاء کا بھی یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکامِ جور کو زکوٰۃ دے دی گئی تو ادا ہو گئی۔ ائمہ اہل بیت و عترۃ نے بھی قولاً و فعلاً اس سے اتفاق کیا۔ جیسا کہ حضرت امام باقر (علیہ وعلیٰ آبائہ السلام) سے اصول میں منقول ہے۔ اور اسی لیے محققین امامیہ و فقہائے زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔

اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا اٰخرھما

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کھڑا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے۔ فرمایا اسے قتل کر دو۔ اس کی زندگی تمام امت کے نظم و امن کے لیے فتنہ ہے۔ وہ امت میں پھوٹ ڈالنا اور جمے ہوئے انتظام کو درہم برہم کر دینا چاہتا ہے۔ والفتنۃ اشد من القتل۔

عن عرفجۃ الاشجعی قال: سمعت صلعم یقول من اتاکم و امرکم جمیع علی رجل واحد، یرید ان یشق عصاکم او یفرق

کیا جا سکے۔

صحابۂ کرام و ائمۂ تابعین کا حال معلوم ہے مروان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابوہریرہ رضؓ مسجدِ نبوی میں مؤذن تھے۔ مروان کی عبادت سے بدتمدنی کا یہ حال تھا کہ سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں کو شرکت کا موقع دینا بھی اس کی جلد بازی پر نہایت شاق گذرتا تھا۔ سورۂ فاتحہ ختم کرتے ہی بلا سکتہ کے قرأۃ شروع کر دیتا۔ حالانکہ احادیث میں آمین کہنے کی نہایت درجہ فضیلت وارد ہے۔ "فمن وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ (بخاری) ابوہریرہ رضؓ اس سے وعدہ لے لیتے "لا تفتنی بآمین" قرأت میں ایسی جلدی نہ مچایئو کہ میری آمین ضائع ہو جائے لیکن نماز اسی کے پیچھے پڑھتے اور اس کی اطاعت سے انکار نہ کرتے (بخاری)

لوگ ان کی یاوہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ عید کے دن نماز کے بعد ہی مجمع منتشر ہو جاتا۔ خطبہ کا لوگ انتظار نہ کرتے یہ حال دیکھ کر مروان نے ایک مرتبہ چاہا۔ کہ عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تاکہ نماز کے انتظار کی وجہ سے لوگوں کو مجبوراً خطبہ سننا پڑے حالانکہ یہ صریح سنت کے خلاف تھا سنّۃ ثابتہ خطبہ عید کے بارے میں یہی ہے کہ نماز پہلے ادا کی جائے۔ پھر خطبہ دیا جائے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اس پر فوراً ایک شخص نے ٹوکا اور حضرت ابوسعید خدری نے "من رای منکم منکرا فلیغیرہ" الخ والی روایت بیان کی۔

ایسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں۔ صحابۂ کرام نہایت بے باکی سے امر

دعوے کو بغاوت و جُرم قرار دے دیا جائے اور اس کے لیے ایسی سزا تجویز کی جائے جو سخت سے سخت سزا ہو سکتی ہے۔ یعنی قتل۔ ایک انسان کو قتل کر دینا بہتر ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ ہزاروں انسان قتل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حکم کی علت کی طرف واضح اشارہ کر دیا گیا کہ یرید ان یشق عصاکم۔

یہ مضمون مختلف الفاظ و اسناد سے صحاح میں مروی ہے۔ ہم نے صرف ایک روایت پر اختصاراً اکتفا کیا

اجماعِ اُمّت و جمہور فقہاء و اعلام

امراء بنو امیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی اور اس وقت ایک جم غفیر صحابۂ کرام و ائمہ اہل بیت نبوت کا موجود تھا۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گزر گئیں اور یہی زمانہ تمام شرعیہ کی تدوین و ترتیب کا ہے تمام ائمہ و اعلام اور فقہاء، مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد و مسائل نے آخری ترتیب و تنظیم پائی۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی اعتقاد و عمل پر رہا۔ عقائدِ ضروریہ اور ارکانِ اربعہ کے بعد شائد ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم و یقینی اجماع و تعامل اُمت ثابت

انہ رای الخلیفۃ اذا ادعیٰ الی کفر او بدعۃ انہ یقام علیہ " یعنی علماء نے اس پر اجماع کیا کہ اگر خلیفہ کفر اور بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا چاہیئے۔ پھر اس قول کی نسبت لکھتے ہیں " ما ادعاہ من الاجماع علی القیام فی ما اذا دعا الی البدعۃ مردود الا اذا حمل علی بدعۃ تؤدی الی صریح الکفر والا فقد دعا المامون والمعتصم والواثق الی بدعۃ القول بخلق القرآن وعاقبوا العلماء من اجلہا بالقتل و الضرب و الحبس و انواع الاہانۃ ولم یقل احد بوجوب الخروج علیہم بسبب ذلک ودام الامر بضع عشرۃ سنۃ حتی ولی المتوکل الخلافۃ فابطل المحنۃ (فتح ۱۳ و ۱۰۳) یعنی جو ابن المتین نے کہا کہ اگر خلیفہ بدعت کی طرف بلائے تو اس پر خروج کرنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے تو یہ قول مردود ہے الا یہ کہ بدعت سے اس کا مقصود ایسی بدعت ہو جو صریح طور پر کفر تک پہنچ جاتی ہو۔ کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ماموں، معتصم، الواثق، تینوں خلیفوں نے بدعت خلق قرآن کی طرف دعوت دی اور اس کی وجہ سے علماء سنت کو طرح طرح کے مصائب و شدائد جھیلنے پڑے، قتل ہوئے، پیٹے گئے، قید کیے گئے۔ لیکن پھر بھی کسی نے ان پر خروج واجب نہیں بتلایا اور برابر ان کی اطاعت کرتے رہے حتیٰ کہ تقریباً دس برس تک یہی حالت رہی۔ خلیفہ متوکل نے تخت نشین ہو کر اس مصیبت کو دور کیا۔ انتہا۔

حقیقت یہ ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت و اطاعت کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا، عہد سلف کے مسلمانوں نے کر کے

بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ ٹوکتے۔ لیکن خلیفہ انہی کو مانتے اور اطاعت انہی کی کرتے کسی صحابی نے بھی اطاعت سے پہلے اس کی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر اس کی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی و شوریٰ منتخب ہونا ہی مقصود تھا۔ باقی شرطیں تو سب اس کے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں۔

حضرت سید التابعین سعید بن المسیب کہا کرتے۔ بنی مروان انسانوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کو کھلاتے ہیں[1] اور پھر ان کے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم و شدائد بھی سہتے مگر ساتھ ہی بحیثیت سلطان اسلام کے اطاعت بھی انہی کی کرتے۔

مامون و معتصم کے عہد میں بدعت اعتزال اور قول بخلق قرآن کی وجہ سے ایک فتنۂ عظیم برپا ہوا، علماء سنتہ پر جو جو مظالم و شدائد ہوئے معلوم ہیں حضرت امام احمد بن حنبل نے اسی کوڑوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کر لیا، اور مامون و معتصم کی دعوت بدعت کی پیروی نہ کی لیکن اطاعت کا مستحق انہی کو سمجھا، اور اپنے نامۂ وصیت میں لکھا تو یہی لکھا: والدعاء لائمۃ المسلمین بالصلاح ولا نخرج علیھم بالسیف و لا نقاتلھم فی الفتنۃ، کذا نقل عنہ ابن جوزی فی سیرۃ۔

حافظ عسقلانی نے ابن التین کا ایک قول نقل کیا ہے۔ قد جمعھا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ۱ : ۴۷

یا دشمنی۔ یا اطاعت کرے گا یا نافرمانی۔ جس کو اطاعت کا مستحق سمجھے گا اس کی ہر بات اس کی نظروں میں محبوب ہو جائے گی۔ جس کو بُرا سمجھے گا اس کی فرمانبرداری کبھی اس کے نفس کو گوارا نہ ہوگی۔ لیکن یہ وہ منزل عمل تھی جس میں ایک ہی وجود ممدوح و مذموم اور محبوب و مبغوض دونوں صورتیں رکھتا تھا۔ ایک ہی انسان کے آگے جھکنا بھی تھا، اور پھر اسی کے سامنے سرکشی بھی کرنی تھی۔ البتہ جھکنے کا موقع دوسرا تھا، سرکشی کی گھڑی دوسری، جذبات عواطف کے لیے سخت آزمائش اس میں آپڑی تھی کہ ہر جذبہ اپنے صحیح موقع پر کام میں لایا جائے۔ ورنہ ذرا سی بے اعتدالی بھی سخت گمراہی و ہلاکت کا موجب ہو جاتی۔ اطاعت کیشی میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ اقتدار اور تاسی ہو جاتی جس کا نتیجہ باطل پرستی اور حق سے انحراف تھا۔ عدم اقتدار اور امر بالمعروف میں اگر بے اعتدالی ہوتی تو وہ خروج و بغاوت تک پہنچا دیتی، جس کا نتیجہ بدامنی و خونریزی ہوتا اور سخت معصیت و فسق کا وقوع۔ اس تیرہ سو برس میں کتنے ہی فتنے صرف اسی بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے پیدا ہوئے۔ کتنوں ہی نے جوش حق پرستی میں بغاوت و خروج کر کے جمعیت امت و استحکام خلافت کو نقصان پہنچایا اور کتنوں ہی نے افراط اطاعت کیشی میں حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر امت کا نظام حق و عدل درہم برہم کر دیا۔

دنیا میں کوئی قوم نہیں جس کے اجتماعی اعمال کی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر مل سکے کہ ایسے سخت و نازک حکم پر عمل کیا گیا ہو اور پوری کامیابی کے ساتھ

دکھلادیا کہ اس کا اصلی مفہوم و مقصد کیا ہے؟ وہ اپنے طرزِ عمل میں احکام خلافت کے ہر ٹکڑے اور ہر قسم کی ایک عملی تفسیر و شرح تھے۔ گذشتہ فصول میں اُن احادیث پر نظر ڈال چکے ہو جن میں آنے والے وقتوں کی نسبت امت کو احکام دیئے گئے ہیں۔ خلافت راشدہ کا عہد فتنوں، فسادوں سے محفوظ تھا۔ لیکن اس کے بعد جو سلسلۂ خلافت شروع ہونے والا تھا، وُہ اپنے متضاد خصائص و حالات کی وجہ سے امت کے لیے ایک بڑی ہی سخت کش مکش اور ابتلا رکھتا تھا۔ وُہ ایک ہی وقت میں سیاہ بھی تھا اور سفید بھی، نور بھی تھا اور ظلمت بھی، حق بھی تھا اور باطل بھی، حب و بغض، ہجر و وصل، ترک و طلب، اطاعت و مخالفت، دونوں چیزیں ایک ہی وجود میں جمع ہو گئی تھیں اور حکم شریعت یہ تھا کہ یک وقت دونوں کو نبھاؤ، اور اپنی اپنی جگہوں پر دونوں باتیں بجا لاؤ۔ ایک طرف تو اس پر زور دیا گیا کہ وہ خلیفہ و امام ہیں، اس لیے واجب الاطاعت ہیں۔ جب تک کفر صریح ظاہر نہ ہو۔ ان کی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑو۔ دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ان کے اعمال اچھے نہ ہوں گے۔ پس اطاعت کرو۔ مگر پیروی و اقتداء نہ کرو۔ بُرائیوں کی طرف بلائیں تو ہاتھ سے، زبان سے، دل کے اعتقاد سے، جس طرح بھی بن پڑے، پوری طرح مخالفت کرو اور ان کے قہر و تسلط سے دب کر حق کا ساتھ نہ چھوڑو۔ غور کرو معاملہ کس درجہ کٹھن اور جذبات انسانی کے لیے کیسا بڑا امتحان تھا؟

انسان ایک وقت میں ایک ہی جذبہ کام میں لا سکتا ہے یا محبت کرے گا

کر کے دکھا دیا۔

مگر ساتھ ہی استقامتِ حق اور امر بالمعروف و دعوت الی السنّتہ کا بھی یہ حال تھا کہ نہ تو عبدالملک کی بے پناہ تلوار اس پر غالب آسکتی تھی۔ نہ حجاج کی خون آشامی، اور نہ مامون و معتصم کی قہرمانیت۔ قدم جب اُٹھتا تھا تو حق کی طرف، زبان جب کھلتی تھی تو سچائی کے لیے اور دل میں کسی کی گنجائش نہ تھی، مگر عشقِ کتاب و سنت کی۔ انہوں نے جس طرح اس حکم کی پیروی کی کہ:

"تسمع وتطیع وان ضرب ظھرک و اخذ مالک فاسمع واطع رواہ مسلم، ٹھیک ٹھیک اُسی طرح اس فرمان کی بھی کہ فان امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ" اور من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ، وان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان رواہ مسلم۔

حضرت امام احمد بن حنبل کی پیٹھ پر تو جلاد تازیانے مار رہے تھے، خود المعتصم سر پر کھڑا تھا۔ تمام پیٹھ سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے اور یہ سب کچھ صرف اتنی بات کے لیے ہو رہا تھا کہ قرآن کی نسبت ایک ایسے سوال کا جواب دے دیں جس کا جواب اللہ کے رسول اور اس کے یاروں نے نہیں دیا ہے۔ اور نہ دینے کا حکم دیا ہے۔ وہ سب کچھ سہہ رہے تھے مگر جواب نہیں دیتے تھے اگر کوئی صدا نکلتی بھی تھی تو یہی نکلتی اعطونی شیئًا من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول درّے مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ثابت کر دکھاؤ تو

اس نے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا ہو۔ لیکن عہدِ صحابہ و سلف کے مسلمانوں نے
صدیوں تک عمل کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی اور اخلاق کی عملی مشکل ایسی نہیں
جو پیروانِ اسلام کے لیے مشکل ہو سکے۔ انہوں نے نہ صرف اس پر عمل
کیا، بلکہ پوری کامیابی کے ساتھ اس اخلاقی امتحان سے عہدہ برا ہو کر
نکلے۔ انہوں نے ایک ہی وقت میں دونوں متضاد عمل کر دکھلائے ——
اطاعت بھی کی اور مخالفت بھی۔ لیکن اطاعت اسی بات میں کی جو مستحق
اطاعت تھی اور مخالفت وہیں کی جہاں مخالفت کرنی تھی۔ یہ "اطاعت" اور
"اقتدار" کے اس نازک فرق کو، جس کو فلسفۂ اخلاق بڑی بڑی دقیقہ سنجیوں کے
بعد حل کر سکتا ہے، انہوں نے اپنی عملی زندگی کی سادگی سے حل کر دکھایا۔
اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ اخلاق کے فلسفہ کے لیے جو چیز سب سے زیادہ مشکل
ہے۔ وہی ایک مؤمن کے عمل کے لیے سب سے زیادہ
آسان ہے۔

قومی حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی
ہے جو صحابہ و تابعین نے بنو امیہ کے امرائِ جور کی کی؟ اور ان کے بعد علمائے
سلف نے بنو عباس کے دعاۃ بدعت کی؟ ہر طرح کے مظالم سہے۔ ہر طرح
کی مصیبتیں جھیلیں، قید کیے گئے، دُرّوں سے مارے گئے، قتل ہوتے مگر
پھر بھی اطاعت سے باہر قدم نہ رکھا، اور ہمیشہ یہی کہتے رہے ینصب
لکل غادر لواء یوم القیامۃ و نحن بایعناھم۔ وہ جو فرمایا تھا: کہ
"قید شبر" بالشت بھر اطاعت سے الگ نہ ہو، سو واقعی ویسا ہی عمل

اپنے استخلاف اور ولی عہدی کا حق پہنچتا ہے اگر وہ خود خلیفہ نہ تھا تو دوسرے کو ولی عہدی کیونکر مل سکتی تھی ؟

آئمہ اہل بیت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنوامیہ و عباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو۔ برخلاف اس کے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ باوجود اظہار استحقاق خود و شکوۂ غصب و تعدّی عدم اطاعت و حکم و خروج سے ہمیشہ مانع رہے۔

سب سے زیادہ قاطع اور فیصلہ کن اُسوۂ حسنہ اس بارے میں خود حضرت علی علیہ السلام کا ہے۔ حضرات امامیہ ان کی خلافت کو منصوص تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں اور کوئی جائز خلیفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بایں ہمہ ظاہر ہے کہ یکے بعد دیگرے تین خلیفہ ہوئے، اور حضرت علیؓ نے نہ تو خروج کیا، نہ بیعت سے انکار کیا، نہ علیحدگی اختیار کی۔ متصل بیس برس تک ان کا یہی طرز عمل قائم رہا۔ اس سے بڑھ کر قاطع و فاصل دلیل اس بات کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے ؟ کہ جب امت ایک سلطان پر مجتمع ہو جائے تو پھر کسی طرح بھی اُس کی مخالفت جائز نہیں اور اس کی اطاعت کرنا ہر فرد پر واجب ہے۔ جب ایک خلیفہ و امام منصوص من اللہ کے لیے انکار جائز نہ تھا، تو عامۂ امت کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے ؟

غرضیکہ اس بارے میں اہل سنت و امامیہ دونوں متفق ہیں۔

اقرار کرلوں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جس کے آگے اتباع و اقتدار کا سر جھک سکے۔

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

سُنّی اور شیعہ دونوں متّفق ہیں

اسی طرح تمام ائمہ اہل بیت کا زمانہ خلفاء بنو امیہ و عباسیہ کے عہدوں میں گذرا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو یقین کرتے تھے نہ کہ بنو امیہ و عباسیہ کو بایں ہمہ کسی نے بھی ان کے خلاف خروج نہ کیا۔ اور نہ اطاعت سے انکار کیا۔ سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت ان کی قائم ہو چکی ہے، اس لیے سلطان وقت وہی ہیں۔

خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خروج کیا ائمہ نے برابر اپنی مخالفت ان سے ظاہر کی۔ جیسا کہ حضرت زید کے خروج اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے۔

حضرت امام علی رضا کو مامون الرشید نے اپنا ولی عہد قرار دیا۔ امام موصوف نے ولی عہدی قبول کرلی۔ یعنی تسلیم کرلیا کہ مامون خلیفہ ہے اور اُس کو

بعض کُتُبِ مشہورۂ عقائد وفقہ

تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے جو کتابیں پڑھی پڑھائی جارہی ہیں ان میں سے بعض کی عبارتیں ہم نقل کریں گے۔

شرح مقاصد میں ہے: واما اذا لم یوجد من یصلح ذالک اولم یقدر علی نصبہ لاستیلاء اہل الباطل وشوکۃ الظلمۃ وارباب الضلال، فلا کلام فی جواز تقلید القضا وتنفیذ الاحکام واقامۃ الحدود وجمیع ما یتعلق بالامام من کل ذی شوکۃ" اور شروطِ امامت بیان کرکے لکھتے ہیں "نعم اذا لم یقدر علی اعتبار الشرائط جاز الابتناء للاحکام المتعلقۃ بالامامۃ علی کل ذی شوکۃ بقدر تغلب او استولی" اور اسی میں ہے "فان لم یوجد من قریش من یجمع الصفات المعتبرۃ، ولی کنانی، فان لم یوجد، فرجل من ولد اسماعیل، فان لم یوجد فرجل من العجم"

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے "واما الخروج علیہم وقتالہم فمحرم وان کانوا فسقۃ ظالمین" اور حدیث من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد کی شرح میں لکھتے ہیں "ای لہ اہلیۃ الخلافۃ والتسلط والغلبۃ"

شامی میں ہے یثبت عقد الامامۃ اما باستخلاف الخلیفۃ

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ حضرات امامیہ اور اہل سنت میں مسئلہ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے، وہ صرف پہلی صورت میں ہے نہ کہ دوسری صورت میں۔ یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امت خلیفہ و امام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے؟ شیعہ کہتے ہیں اس کا استحقاق صرف ائمہ اہل بیت کو ہے۔ وُہی امام ہو سکتے ہیں۔ اہل السنت کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں۔

لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہو گیا ہو، تو اس کی اطاعت پر جس طرح اہلِ سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں، ٹھیک اسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں اہلسنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاء راشدین ہی میں جمع تھیں اور انہیں کا انتخاب صحیح نظامِ شرعی کے مطابق ہوا۔ ان کے بعد پھر نہ ہوا۔ امامیہ کے نزدیک ابتداء ہی سے نہ ہوا۔ لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی۔ شیعوں نے بھی ضروری قرار دی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سُنّی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زیدیہ وغیرہ فرقوں کا ہے۔

الفقہاء فی وجوب بلزوم جماعۃ المسلمین وترک الخروج علی ائمۃ الجور لانہ وصف الطائفۃ الاخیرۃ بانہم دعاۃ علی ابواب جہنم مع ذالک امر بلزوم الجماعۃ"

اور حدیث "اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کی شرح میں لکھتے ہیں" واما لو تغلب عبد حقیقۃ بطریق الشوکۃ فان طاعتہ تجب اخماداً للفتنۃ"

حافظ نواوی شرح میں لکھتے ہیں" وھٰذا الحدیث فی الحث علی السمع والطاعۃ فی جمیع الاحوال وسببہا اجتماع کلمۃ المسلمین فان الخلاف سبب لفساد احوالہم فی دینہم ودنیاہم وقولہ صلعم: وان کان عبد مجدع الاطراف یعنی مقطوعہا والمراد اخس العبید۔ ای اسمع واطیع للامیر وان کان دنی النسب ویتصور امارۃ العبد اذ ولاہ بعض الائمۃ او یغلب علی البلاد بشوکتہ الخ (جلد ۲ : ۱۲۵)

اور قاضی شوکانی درر البہیہ میں لکھتے ہیں" وطاعۃ الائمۃ واجبۃ الا فی معصیۃ اللہ ولا یجوز الخروج علیہم ما اقاموا الصلوٰۃ۔

(شرح درر ۱۰۴۳۳)

اور حجۃ اللہ البالغہ میں ہے" ان الخلیفۃ اذا انعقدت خلافتہ ثم خرج آخر ینازعۃ حل قتلہ"

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلہ خلافت وحقیقت

اباہ کما فعل ابو بکر، واما بیعۃ" جماعۃ من العلماء او من اھل الرائے۔

مسامرہ میں ہے:" والمتغلب تصح منہ ھذہ الامور رای ولایۃ القضاء والامارۃ والحکم بالاستفتاء ونحوھا) للضرورۃ، وصار الحال عند التغلب کما لم یوجد قرشی عدل، او وجد ولم یقدر رای لم توجد قدرۃ علی تولیتہ لغلبۃ الجورۃ) اذ یحکم فی کل من الصورتین بصحۃ ولایۃ من لیس بقرشی ومن لیس بعدل للضرورۃ"

اور شرح مواقف میں امامت کی شرطیں بیان کر کے لکھتے ہیں۔

"لکن للامۃ ان ینصبوا نافذھا، دفعا للمفاسد التی تندفع بنصبہ

(۴ا؍۶)

سب سے زیادہ مشرح بحث حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں کی ہے :۔

"وقد اجتمع الفقہاء علی وجوب طاعۃ السلطان المتغلب والجہاد معہ۔ وان طاعۃ خیر من الخروج علیہ لما فی ذالک من حقن الدماء وتسکین الدھماء، ولم یستثنوا من ذلک الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح۔ فلا یجوز طاعتہ فی ذلک بل تجب مجاھدۃ لمن قدر علیھا کما فی الحدیث" (جلد ۱۳: ۷)

اور روایت حذیفہ" فاعتزل تلک الفرق کلھا" الخ مندرجہ کتاب الفتن کی شرح میں لکھتے ہیں" قال ابن بطال: فیہ حجۃ لجماعۃ

اور حق کے اظہار و اعلان میں کسی طرح کی مداہنت گوارا نہ کرنی چاہیے۔ لیکن اگر اس کی طاقت اپنے اندر نہ دیکھیں تو پھر اس ملک سے ہجرت کر جائیں۔ یعنی یہ کسی حال میں جائز نہیں کہ تسلط کفر پر قانع و رضامند ہو کر زندگی بسر کریں۔

من حمل علینا السلاح فلیس منّا

سورۃ نساء میں ہے:

ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاءہ جھنم خالداً فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ، واعد لہ عذاباً عظیماً

جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ کی ہمیشگی ہے۔ اللہ کا غضب ہے، اس کی پھٹکار ہے اور بڑا ہی دردناک عذاب ہے جو اس کے لیے تیار ہو چکا ہے۔

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی و ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی حق شرعی کے دوسرے مسلمان کو قتل کرے، وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ کے غضب و لعنت کا مورد ہو گا۔ اور عذاب الیم کا مستحق۔

بخاری و مسلم میں ہے "سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر" رواہ

خلافت پر کرتے ہوئے جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے) لکھتے ہیں "وحرام ست خروج بر سلطان بعد ازاں کہ مسلمین بروئے جمع شوند، مگر آنکہ کفر بواح از وے دیدہ شود، اگرچہ آں سلطان مجتمع شرائط نہ باشد و ایں مضمون متواتر بالمعنی ست" (جلد ۱ : ۱۲۷)

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گذر چکا۔ یعنی ہر زمانے میں امت کے لیے ایک خلیفہ ہونا چاہیئے جو صاحب طاقت و اقتدار ہو۔ اگر امت منتخب کرے تو اس کے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں۔ لیکن اگر کسی مسلمان کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور وہی صاحب اقتدار و شوکت ہے تو اسی کو خلیفہ ماننا چاہیئے۔ خواہ تمام شرطیں اس میں پائی جائیں، یا نہ پائی جائیں قرشی ہو یا غیر قرشی، ظالم ہو یا عادل، عالی خاندان ہو یا دنی النسب حتی کہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی اطاعت و حمایت ہر مسلمان پر واجب ہے۔ جب تک کفر صریح اس سے ظاہر نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا ہوا، تو پھر نہ بیعت قائم رہی نہ عہد اطاعت باقی رہا۔ اس حالت میں مسلمانوں پر واجب ہو جائے گا کہ اس کا مقابلہ کریں۔ جو شخص مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہ دیکھے، وہ اس کے ملک سے ہجرت کر جائے۔ فمن قام علی ذالک فلہ الثواب ومن واھن فعلیہ الاثم ومن عجز وجبت علیہ الھجرۃ من تلک الارض" کذا فی الفتح

فتح الباری کی اس عبارت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جس ملک میں کفار کی سلطنت قائم ہو جائے، وہاں مسلمان کو خروج کرنا چاہیئے

وکذا صححہ ابوحاتم من ھذا الوجہ۔ یعنی فرمایا: جب کبھی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ فتح الباری میں ہے۔ قال ابن العربی اذا استحق الذی یشیر بالحدید اللعن، فکیف الذی یصیب بھا؟ وانما استحق اللعن اذا کانت اشارتہ تھدیدا، سواء کان جادا ام لاعبا (جلد ۱۳ : ۲۱) یعنی ابن العربی نے کہا: جب صرف ہتھیار اُٹھا کر اشارہ کرنے کی نسبت ایسی شدید وعید آئی کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں تو اس بدبخت کا کیا حال ہوگا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے بلکہ سچ مچ اپنے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر ڈالے اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہوتا ہے تو اس سے مقصود وہی شخص ہوگا جو ڈرانے کے لیے ایسا کرے خواہ غصہ سے ہو خواہ ہنسی سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی سے بھی کوئی شخص ہتھیار اٹھا کر کسی مسلمان کو ڈرائے تو وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔ یعنی کسی حال میں بھی یہ بات مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔ اور یہ فعل اس درجہ شریعت کے نزدیک مبغوض ہے کہ اس کی ہنسی دل لگی بھی لعنت کا موجب ٹھہری۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مرفوعاً مروی ہے "زوال الدنیا کلھا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم (اخرجہ الترمذی وقال حدیث حسن واخرجہ النسائی ولفظ ، قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا") آنحضرتؐ نے فرمایا۔ اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے زائل ہو جانے

الترمذی وصححہ ولفظہ۔ قتال المسلم اخاہ کفر و سبابہ فسوق)
یعنی مسلمان کو دشنام دینا فسق ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر۔
آنحضرت نے آخری حج کے موقعہ پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا اور جو
خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، اس میں ہمیشہ کے لیے تمام امت
کو وصیت فرمائی "لا ترجعوا (و فی روایۃ لا ترجعون) بعدی کفاراً
یضرب بعضکم رقاب بعض (بخاری) میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو
جانا کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کی گردن اڑاتے۔
اور بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے " لا یشیر احدکم
علی اخیہ بالسلاح فانہ لا یدری لعل الشیطان ینزع فی یدہ
(و فی روایۃ ینزغ بالعین) فیقع فی حفرۃ من النار (و ایضاً اخرجہ
مسلم عن ابن رافع، و ابونعیم فی المستخرج من مسند ابن راھویۃ)
یعنی فرمایا: کبھی اپنے بھائی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو ممکن ہے
کہ ہتھیار لگ جائے اور تم جہنم کے گڑھے میں گر پڑو۔ یعنی اگر اشارہ کرنے
میں تلوار کام کر گئی اور مسلمان کا خون ہو گیا، تو ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائے
گا جس کی پاداش عذاب جہنم ہے۔
اور ابن ابی شیبہ نے ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ الملائکۃ
تلعن احدکم اذا اشار الی الآخر بحدیدۃ و ان کان اخاہ لابیہ و امہ"
اور امام ترمذی نے ایک دوسری سند سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ من
اشار الی اخیہ بحدیدۃ لعنہ اللہ الملائکۃ" قال حسن صحیح غریب)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو آپ نے فرمایا

تزودمن الماء البارد فانک لن تدخل الجنۃ (رواہ البیھقی)

بن پڑے تو اچھی طرح ٹھنڈے پانی کی تیاری کرے کیونکہ تیرا ٹھکانہ دوزخ ہے، تو یقیناً جنت میں نہ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا کہ اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔

شریعت نے مسلمانوں کی جمعیت و قومیت کی بنیاد باہمی مؤاخات پر رکھی ہے۔ ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا رشتہ ہے۔

فاصبحتم بنعمتہ اخوانا (۳ : ۱۰۳) انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم (۴۹ : ۱) مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس جب دو بھائیوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرا دو، مسلمانوں کی قومی سیرۃ جابجا یہ بتلاتی ہے اذلۃ علی المومنین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۲) سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی دوسرا نفس مدعی نہیں ہوتا۔ البتہ پرسش ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض انجام دیئے گئے یا نہیں؟ لیکن دوسری قسم کے لیے پرسش کافی نہیں فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وُہ ایسے کام ہیں۔ جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی کے کھڑے ہوں گے۔ نماز پہلی قسم کے اعمال میں سب سے زیادہ اہم ہے اور قتل نفس کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ پس جب حساب ہو گا۔ تو سب سے پہلے نماز کی نسبت پوچھا جائے گا اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب سے پہلے قتل کا معاملہ پیش ہو گا۔

سے بھی بڑھ کر جو چیز ہے۔ وہ ایک مسلمان کا قتل ہونا ہے اور اسی بنا پر فرمایا:
اول ما یقضی بین الناس فی الدماء (رواہ البخاری عن
ابن مسعود و زاد مسلم "فی یوم القیٰمۃ") قیامت کے دن سب
سے پہلے جو معاملہ چکایا جائے گا۔ وہ انسان کا خون ہے[1]

---

[1] یہاں یہ شبہ وارد نہ ہو کہ یہ حدیث محاسبہ صلوٰۃ مشہور حدیث سے معارض ہے کیونکہ نماز کی نسبت قضا کا لفظ نہیں آیا ہے۔ حساب کا آیا ہے۔ بخاری کی روایت میں ہے" اوّل ما یحاسب بہ المرء صلاتہ قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائے گا، وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائے گا ان میں سب سے پہلا معاملہ خون کا ہوگا۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ چنانچہ نسائی نے یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی متن و اسناد سے روایت کیے ہیں اوّل ما یحاسب بہ العبد الصلوٰۃ و اول ما یقضٰی بین الناس فی الدماء"۔ امام بخاری نے مندرجہ متن حدیث ابن مسعود سے بطریق اعمش عن ابی وائل روایت کی ہے اور منجملہ ثلاثیات بخاری کے ہے۔ نسائی بھی یہ روایت ابو وائل کے طریق سے لائے ہیں۔ پس سنداً متناً روایت ایک ہی ہوئی۔ باقی رہا محاسبہ و قضاء کا فرق تو وہ بالکل ظاہر ہے۔ بعض اعمال انسان کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں بعض دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے پہلی قسم کے کاموں میں قضا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر شخص کی ذات خاص

تم کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت و پیار نہ کرو۔

اور فرمایا "لا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تناجشوا، ولا تباغضوا، ولا تدابروا ولا تنابزوا وکونوا عباد اللہ اخوانا" (شیخان) ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو، باہم کینہ اور عناد نہ رکھو، بدگوئی نہ کرو، اور ایسا کرو کہ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حضرت جابرؓ کو وصیت کی "ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبک غش لاحد" (مسلم) تجھ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اس کی کرنوں کی طرح تیرا دل بھی صاف ہو اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کی طرف سے تیرے اندر کھوٹ نہ ہو۔

اور فرمایا "المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ" (بخاری) مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

اور فرمایا "المسلم اخو المسلم، لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ" (مسلم) مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ پس اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو ظلم کرے نہ اسے ذلیل کرے، نہ اس کو حقیر جانے۔

اور فرمایا: "لا یحل لرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث" (شیخان) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے۔

اور فرمایا: "ملعون من ضار مومنا او مکر بہ" (ترمذی) اللہ کی اس

اعزۃ علی الکافرین ر اشداء علی الکفار رحماء بینھم ا

ان میں جس قدر بھی نرمی ہے مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ جس قدر بھی سختی ہے غیروں کے ساتھ۔ وہ سب سے زیادہ نرم بھی ہیں اور سب سے زیادہ سخت بھی۔ نرم اپنوں کے لیے سخت غیروں کے لیے۔ ان کے پاس محبت بھی ہے عداوت بھی، لیکن محبت پرستاران حق کے ساتھ کرتے ہیں، عداوت دشمنانِ حق کے ساتھ۔

احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات و تمثیلات ملتی ہیں، وہ مشہور و معلوم ہیں اور مہاجرین و انصار اور عموم صحابہ کرام نے ان کی عملی تصویر بن کر ہمیں بتلا دیا ہے کہ اخوتِ دینی کے معنی کیا ہیں ؟ ہر مسلمان پر اس کی نماز اور روزہ سے بھی بڑھ کر جو چیز فرض کر دی گئی وہ یہی ہے کہ مسلمانوں سے محبت کرے، جہاں تک بن پڑے ان کی بھلائی چاہے، اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے کسی مسلمان کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں تو ایمان و اسلام بھی نہیں۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد و عبادت ہو اور سمندر جتنی بھی دولت خرچ کر ڈالی جائے لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بیکار و عبث ہے۔

فرمایا! لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (رواہ الشیخان) کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے، وہی اپنے بھائی مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔

اور فرمایا؛ لا تدخلون الجنۃ حتی تومنوا ولا تومنون حتی تحابوا؎

اور ان سارے گناہوں میں جو انسان کے ہاتھ پاؤں کر سکتے ہیں۔ کونسا گناہ ہے جو اس سے زیادہ ملعون و مردود ہو سکتا ہے۔

دنیا کی کونسی بڑائی و عظمت ہے جو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ سے بڑھ کر خدا کی نظروں میں عزت رکھتی ہو؟ اور کونسی محبوبیت ہے جو اس کلمۂ عزیز کے اقرار کرنے والے کو اللہ کے حضور نہیں مل جاتی؟ پس جس بدبخت کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ ہو جائے کہ باوجود دعوائے اسلام مسلمانوں کا خون بہانے لگے، وہ یقیناً مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا بلکہ اللہ کے کلمۂ توحید کو ذلیل و خوار کرتا ہے اور اس کی عزت و جلال کو بٹہ لگانا چاہتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ ان کو آنحضرت نے بنو الحرقہ کی طرف ایک فوجی مہم دے کر بھیجا تھا۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا۔ ساتھ ہی ایک انصاری بھی حملہ آور ہوا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اس کے سر پر چمکی تو وہ پکار اٹھا "لا الٰہ الا اللہ" میں نے کچھ پرواہ نہ کی اور قتل کر ڈالا۔ لیکن کلمہ کی صدا سن کر انصاری نے تلوار روک لی۔ آنحضرتؐ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو نہایت ناراض و غمگین ہوئے اور فرمایا اقتلته بعد ما قال لا الٰہ الا اللہ تو نے اسے قتل کر دیا باوجود اس کے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا؟ میں نے عرض کیا انما کان متعوذا وہ تو محض اس نے میری تلوار سے بچنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ فی الحقیقت مسلمان نہیں ہوا تھا" فما زال یکررها علی تمنیت انی لم اکن اسلمت قبل ذالك الیوم لیکن آنحضرتؐ برابر یہی جملہ دہراتے رہے۔

پر پھٹکار جس نے مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اس کو دھوکا دیا۔

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یحد النظر الی اخیہ" (رواہ الحاکم وصححہ) جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کو نہ چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف تیز نظروں سے گھورے۔ یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے تو محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھے۔

پس جب اللہ کی شریعت حقہ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت و برادری پر رکھی، اسی کو ایمان کی جڑ قرار دیا۔ یہی اسلام کی اصلی پہچان ہوئی، اسی پر ایمان کی تکمیل موقوف ٹھہری تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے ہوئے رشتے کو توڑ دے اور اپنے انہی ہاتھوں سے جو مسلمان کی دستگیری و مددگاری کے لیے بنائے گئے تھے، مسلمانوں کی گردنیں کاٹے اس سے بڑھ کر خدا کی زمین پر اس کی شریعت کا کون مجرم ہو سکتا ہے؟ اور اگر انسان کی برائیاں اور بدعملیاں اللہ کی لعنت کا مستحق ہو سکتی ہیں، تو اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو اللہ کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی بوندوں کی طرح آسمانوں سے زمین پر برسنے لگیں۔

جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ بتلائے، اسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھوں بہے؟ اس سے بڑھ کر شریعت الٰہی کی کیا توہین ہو سکتی ہے؟

وقال اسلمت اللہ اأقتلہ بعد ان قالھا ؟" اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ کریں اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اس طرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے پھر الگ ہو کر کہے، میں اللہ پر ایمان لایا۔ تو یہ کہنے کے بعد اُسے قتل کروں یا نہ کروں ؟ فرمایا لاتقتلہ مت قتل کر۔" قال انہ طرح احدی یدی ثم قال ذالک بعد ما قطعھا" مقداد نے عرض کیا۔ اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ ڈالا اور اس کے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا پھر کیوں نہ اس سے اپنا بدلہ لوں ؟ فرمایا" لاتقتلہ فان قتلتہ، فانہ بمنزلتک قبل ان تقتلہ، وانت بمنزلۃ قبل ان یقول کلمۃ التی قال" جو کچھ بھی ہوا ہو۔ لیکن جب کلمۂ توحید کا اقرار کر لیا تو پھر قتل نہ کر۔ اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا۔ اور تو مسلمان، لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اُسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائے گا۔ اور تو اس کی جگہ۔

بہر روایتیں اس بارے میں نہایت ہی عبرت انگیز ہیں۔ جب اللہ کے رسول کا یہ حال تھا کہ ایک مشرک دشمن کا جنگ کی حالت میں بھی قتل ہو جانا گوارا نہ ہوا۔ کیونکہ اس نے خوفِ جان سے ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تھا اور اس پر اس قدر رنج و افسوس فرمایا کہ عرصہ تک صدائے الم زبان مبارک سے نکلتی رہی تو پھر غور کرو کہ جو مسلمان ان مسلمانوں کو قتل کرے جن کی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوئی ہیں اور جنہوں نے محض خوف جان سے ایک مرتبہ ہی نہیں۔ بلکہ دل کے یقین و ایمان سے لاکھوں مرتبہ، کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار۔ اور ورد کیا ہے۔ اس کی شقاوت و خسران کا کون اندازہ

تو نے قتل کر ڈالا باوجود یکہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا۔ یہاں تک کہ آنحضرت کا حزن و ملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھ کر مجھے اس قدر ندامت ہوئی کہ دل نے کہا، کاش آج کے دن سے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے "افلا شققت عن قلبہ حتی تعلم" تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں۔ یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اس کا احترام واجب ہو گیا۔ خواہ تلوار کے ڈر سے کہا ہو یا سچ مچ دل سے اقرار کیا ہو۔ دل کا حال صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔

یہی واقعہ صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اس میں بعض زیادات ہیں۔ وفیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ فکیف تصنع بلا الہ الا اللہ اذا اتتک یوم القیامۃ؟ قال یا رسول اللہ استغفرلی۔ قال فکیف تصنع بلا الہ الا اللہ؟ فجعل لا یزید ہ علی ذالک یعنی آنحضرت صلعم نے اسامہ سے کہا "قیامت کے دن جب لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ تیرے سامنے آئے گا تو اس وقت تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ کو کیا جواب دے گا؟ اسامہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اب تو مجھ سے یہ قصور ہو گیا۔ میری بخشش کے لیے دعا کیجئے۔ لیکن آنحضرت یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن لا الٰہ الا اللہ کا جب دعویٰ ہو گا تو تم کیا جواب دو گے؟ اور اس جملہ کے سوا کوئی بات نہ فرمائی۔

بخاری میں ہے کہ آپ سے مقداد بن عمرو الکندی نے پوچھا ان لقیت کافراً فاقتتلنا، فضرب یدی بالسیف فقطعھا ثم لاذ بشجرۃ

ہو چکا ہے، اور اسی لیے صحابہ و سلف سے مروی ہے "کفر دون کفر و ظلم دون ظلم" اور پھر جس طرح ایمان و اسلام اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی یعنی اعتقادات و معنویات میں بھی ہے، اور عملیات و ظواہر میں بھی۔ فکر میں بھی ہے اور فعل میں بھی ایمان باللہ والرسل بھی اسلام ہے اور نماز بھی اسلام ہے ٹھیک اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر و نفاق اعتقادات و افکار کا ہے۔ ایک اعمال و افعال کا شرک کفر اعتقادی ہے اور ترکِ صلوٰۃ متعمداً کفر عملی۔ پس یہ جو فرمایا کہ سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر اور فجزاءہ جہنم خالداً فیہا اور لاترجعوا بعدی کفارا" اور فلیس منا"، تو ان میں اور عموم کفر و اسلام میں کوئی تعارض نہیں۔ نہ لفظ "کفر" کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ نفی اسلام کو نفی کمال پر محمول کرنے کی ضرورت۔ شارع نے جس فعل کو کفر کہا، وہ کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر

لہ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا "کفران العشیرۃ و کفر دون کفر" لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ امام محمد کے کتاب الایمان میں عطا بن ابی رباح وغیرہ کے طرق سے روایت کیا ہے، اور امام ابوالحسن اشعری نے بھی مقالات طوائف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ یہ قول متعدد صحابہ سے منقول ہے، اور سلف میں عام طور پر زبان زد تھا۔ کما نقل عنہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فی کتاب الایمان۔

کر سکتا ہے؟ اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کونسا فعل ہے جو
ایک مسلمان کے لیے عذاب الیم کا مستوجب ہو؟
یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس فعل کے لیے وُہ وعید فرمائی جو کسی
معصیت کے لیے نہیں فرمائی۔ یعنی فجزاءہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ
علیہ ولعنہ اس میں خلود فی النار، غضب، لعنت تین چیزوں کا ذکر کیا ہے
اور تمام قرآن وسنت میں یہ تینوں کلمات وعید کفار کے لیے مخصوص ہیں۔
مسلمانوں کی نسبت کہیں استعمال نہیں کیے گئے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ عام
معاصی وفسوق سے اس فعل کی برائی کہیں زیادہ ہے۔ کفر صریح وقطعی کے
بعد، اور عام معاصی سے اشد، کوئی فعل ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اور
اسی لیے تمام احادیث میں اس فعل کو کفر فرمایا کہ " وقتالہ کفر" اور لا
ترجعوا بعدی کفارا"۔ معصیت وفسوق کا لفظ اس کی ناپاکی وطعونیت
ظاہر کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ جب مسلمان کو صرف دشنام دینا فسق ہُوا
کہ سباب المسلم فسوق تو پھر اس کو قتل کر دینا صرف فسق ہی
کیوں ہو؟

ثانیاً جس طرح ایمان واسلام کی شرح کچھ اوپر شاخیں ہیں اور ان
میں سے ہر شاخ ایمان واسلام ہے " الایمان بضع وسبعون شعبۃ
اعلاھا لا الہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق (رواہ مسلم
واصحاب السنن الثلاثۃ، ورواہ البخاری بضع وستون)، اسی طرح کفر
کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ وادنیٰ مراتب ہیں جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت

ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزا دینے اور خوف الٰہی سے بدحال کر دینے کے لیے بس کافی ہیں۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے سرزد ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان نہیں کر سکتا۔

قرآن میں "لعنت" اور "غضب" کا لفظ کفار و منافقین کے لیے مخصوص ہے۔ لعنت کے معنی یہ ہیں کہ رحمتِ الٰہی سے مہجوری اور ہر طرح کی کامیابیوں اور فلاح سے محرومی۔ یہودی ملعون و مغضوب ہوئے اور عزت و حکومت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ سورۂ احزاب میں منافقین پر لعنت وارد ہوئی۔" ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ۔ چنانچہ وہ سب نابود و مخذول ہو گئے۔ کیونکہ ایمان و اسلام کے خصائص بالکل اس سے متضاد ہیں۔ وہ رحمت الٰہی کا مورد اور فلاح و مراد کا سرچشمہ ہیں۔ اس لیے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ جہاں ایمان ہو وہاں لعنتِ الٰہی کا بھی ورود ہو سکے۔ احادیث میں جا بجا ایسے واقعات ملیں گے کہ سخت سے سخت معاصی و فسوق کا جن لوگوں سے ارتکاب ہو گیا تھا، ان پر بھی لعنت کرنے سے آنحضرتؐ نے روکا۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے۔" ما یکرہ من لعن شارب الخمر یعنی جو مسلمان شراب پینے کی معصیت میں مبتلا ہو جائے اس پر لعنت کی ممانعت کیا اس میں عبداللہ ملقب" بہ الحمار" کا واقعہ بہ روایت حضرت

ہی ہے اور کفر ہی رہے گا۔ البتہ یہ کفر بھی مثل دیگر اعمال کفریہ کے عملی کفر ہے، نہ کہ کفر اعتقادی و مخرج عن الملت۔ اس کا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسا نماز چھوڑ دینے والا مسلمان جس کے کفر پر صحابہؓ کرام کو اتفاق تھا" وکان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ (ترمذی) من الاعمال کی قید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے وہ بات ترکِ صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن بلا شبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو مخرج عن الملت ہے جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک اس معنی میں کافر نہیں ہو سکتا" ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ ویغفر ما دون ذالك لمن یشاء اور حدیث ابوسعید خدری کہ اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من الایمان (رواہ البخاری)

پس اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانا شریعت کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر عند اللہ کوئی برائی نہیں اور یہ قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ کتاب و سنت میں جن جن لفظوں اور وعید و امتناع کے جیسے پیرایوں میں اس فعل کا ذکر کیا ہے وہ عام معاصی و فسوق کے لیے کبھی اختیار نہیں کیے گئے اور وہ ایسے سخت و شدید

لعنت وملعون کا لفظ وارد ہوا۔ صرف اسی ایک بات سے فیصلہ کرلو۔ خواہ یہ فعل کفر قطعی ومخرج عن الملت ہو یا نہ ہو، لیکن اللہ کی شریعت کے نزدیک اس کا ارتکاب کس درجہ مبغوض وملعون ہے؟ اور جو مسلمان اس کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے حضور کس طرح اپنے اسلام وایمان کی ساری رحمتیں اور برکتیں کھو دیتا ہے؟

"ثالثاً" اس باب میں فیصلہ کن حدیث وہ ہے جس کو ہم نے بہ اتباع تبویب بخاری، اس فعل کا عنوان قرار دیا ہے اور جس کو امام موصوف اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا۔ یعنی من حمل علینا السلاح فلیس منا۔" (رواہ ابن عمر، وسلمہ، وابو موسیٰ الاشعری، وفی روایت سلمہ من سل علینا السیف) جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔" ومعنی الحدیث حمل السلاح علی المسلمین لقتالھم بہ بغیر حق۔ (فتح ۱۲ : ۲۰)

یہ حدیث نہایت اہم ہے اور منجملہ قواعد وکلیات شریعت کے ہے اسی لیے امام بخاری نے کتاب الفتن میں ایک خاص عنوان باب قرار دیا اور امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان وکفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں اور حافظ نواوی نے ایک مستقل عنوان قرار دے کر باب باندھا۔

"لیس منا" کے معنی ہیں "ہم میں سے نہیں ہے" یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز تکلم وخطاب پر غور کرنے سے

عمرؓ لائے ہیں۔ یہ شخص بار بار شراب نوشی کے جرم میں ماخوذ ہو چکا تھا۔ سزائیں پاتا تھا۔ توبہ کرتا تھا۔ پھر مبتلا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ماخوذ ہوا تو بعض مسلمان بول اٹھے "اللھم العنہ ما اکثر ما یوتی بہ" اس پر خدا کی لعنت ہو۔ لیکن آنحضرت نے نہایت سختی سے روکا۔ "لا تلعنوہ" (وفی لفظ لا تلعنہ) فواللہ ما علمت انہ یحب اللہ ورسولہ (وفی روایتہ فانہ یحب اللہ ورسولہ) اس پر لعنت نہ بھیجو۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبدالبر کا قول نقل کیا ہے۔

"انہ اتی بہ اکثر من خمسین مرۃ فتامل!

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت مندرجہ کتاب الدیات بخاری کہ ایک شخص اسی جرم میں ماخوذ ہوا اور اس کو پیٹنے کا حکم دیا گیا۔ کسی نے کہا۔ اخذلک اللہ" خدا تجھے رسوا کرے فرمایا" لا تقولوا ھکذا۔ لا تعینوا علیہ الشیطان" اور سنن ابو داؤد میں ابن وہب کے طریق سے ہے۔ ولکن قولوا اللھم اغفر لہ اللھم ارحمہ" بددعا نہ دو۔ بلکہ یوں کہو خدایا اس پر رحم کر۔ خدایا اسے بخش دے! قلت وما اصلح فی ھذا المقام قول الشاعر العارف۔

فدائے شیوۂ رحمت، کہ در لباس بہار

بعذر خواہی رنداں بادہ نوش آمد

لیکن صرف قتل مسلم ہی ایک ایسی معصیت ہے جس کے لیے قرآن نے "لعنت" اور "غضب" کے الفاظ استعمال کیے اور احادیث میں بھی جا بجا

ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔
یہ جو آج تمام عالم اسلامی میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً یک قلم مرجی و جہمی
زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگرچہ اعتقاداً اہل سنت ہونے کا دعویٰ کرتے
ہوں اور اسلام کی تعریف میں "عمل بالارکان" کا لفظ صرف درسی کتب عقائد
کے صفحات پر رہ گیا ہے، عمل میں اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا تو اس کے
متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی بدعت تاویل ہے۔ اسی بدعت
کی وجہ سے اعمال کی اہمیت و مطلوبیت بالکل جاتی رہی اور ادعاء اسلام کا
سارا دارومدار صرف چند جزئیات عقائد کے تحفظ و نزاع پر رہ گیا۔ یہ کیا بات
ہے کہ ایک شخص کتنا ہی فاسق و فاجر ہو، لیکن اگر چند نزاعی عقائد میں ہمارا
ہم داستان ہوتا ہے۔ تو ہم اس کو دنیا کی سب سے بہتر مخلوق یقین
کرتے ہیں؟ اور ایک شخص کتنا ہی صاحب عمل و صلاح ہو، لیکن اگر چند
اختلافی جزئیات عقائد میں ہم سے متفق نہیں، تو پھر اس سے زیادہ شر البریۃ
ہماری نظروں میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ وہی عملی مرجیت و جہمیت اگرچہ زبان
سے ادعاء اتباع سنت و سلف!

یہی وجہ ہے کہ آئمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا، اور
ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رائے اور تعمق کی بدعتوں تک لے جانے
والی تھیں۔ اسی حدیث کی نسبت امام نواوی اور حافظ عسقلانی وغیرہما لکھتے
ہیں "وکان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ لیس منا بلیس
علی ھدینا، ویقول بئس ھذا القول۔ یعنی بل یمسك عن تاویلہ

معلوم ہوتا ہے کہ "لیس منا" وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے تھے[1] جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ سے کوئی بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتلانا ہوتا تھا۔ عام معاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے، اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو جو اوپر گذر چکی ہے تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔ پس کچھ ضروری نہیں ہے کہ "لیس منا" کے یہ معنی کیے جائیں کہ لیس علی ھدینا یا ظاہر منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور تاویل کی جائے یا نفی کو نفی کمال پر محمول کیا جائے۔

صاحب شریعت نے جن کاموں کے لیے جو احکام دیے اور جو الفاظ استعمال کیے ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور گھٹانے کی کوشش کریں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے

---

[1] احادیث میں بعض اعمال کی نسبت "لیس منی" آیا ہے اور بعض کی نسبت "لیس منا" جیسے النکاح من سنتی فمن رغب عنها فلیس منی" دونوں میں فرق ہے لیس منا" میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود امت ہے اور "لیس منی" میں اپنی ذات خاص کا ذکر ہے جس سے مقصود ترک سنت ہے پس جن احادیث میں "لیس منا" کی وعید آئی ہے ان سے مقصود وہی ہوگا جو متن میں لکھا ہے اور جن میں "لیس منی" ہے ان سے مقصود صرف ترک اتباع سنت و اسوۂ نبوت ہوگا۔

اقسامِ ثلاثۂ قتل مُسلم وحملِ سلاح

البتہ واضح رہے کہ قتل مسلم سلاح کی متعدد صورتیں ہیں، اور ہر صورت کا حکم شرعی دوسرے سے مختلف ہے۔

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے، لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے۔ اس کی حرکت کا معترف ہو، اور اس کے ارتکاب پر شرمندہ و متاسف ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو گزشتہ فصل میں گزر چکا۔ یعنی وہ عملی کفر ہے۔ مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہیں ہو جائے گا۔ دنیا میں اسلام کے قومی احکام و معاملات اس پر جاری ہوں گے۔ عاقبت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ قاتل مسلم کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں خود صحابہ وسلف سے اختلاف منقول ہے۔ ایک جماعت اس طرف گئی کہ سورۃ فرقان میں ہے، والذین لا یدعون مع اللہ الٰہاً آخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق الخ پھر فرمایا الا من تاب وآمن وعمل صالحاً فاولٰئک یبدل اللہ سیئاتہم حسنات۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام معاصی کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہو سکتی ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس سے بخاری ومسلم وغیرہما میں مروی ہے۔ جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے۔ اس کی توبہ مقبول نہیں

(شرح مسلم مطبوعہ احمدی: ۶۹ و فتح الباری ۱۳: ۲۰) یعنی سفیان بن عیینہ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ "لیس منا" کی تفسیر یوں کی جائے کہ لیس علی ھدینا" اور اس تفسیر کی نسبت کہا کرتے تھے کہ کیا ہی بُرا قول ہے مقصود ان کا یہ تھا کہ ان نصوص کی تاویل نہ کرنی چاہیئے۔

اسی طرح شیخ عبدالوہاب شعرانی نے میزان میں امام سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے۔

"ومن الادب اجزاء الاحادیث التی خرجت فخرج الزجر والتنفیر علی ظاھرھا من غیر تاویل، فانھا اذا اوّلت، خرجت من مراد الشارع کحدیث من غشنا فلیس منا، و لیس منا من لطم الخدود وشق الجیوب ودعی بدعوۃ الجاھلیۃ فان العالم اذا اولھا۔ بان المراد لیس منا فی تلک الخصلۃ فقط ای وھومنا فی غیرھا، ھان علی الفاسق الوقوع فیھا وقال مثل المخالفۃ فی خصلۃ واحدۃ امر سھل۔"

"لیس منا" کے صاف معنی یہ ہیں کہ وُہ ہم میں سے نہیں۔" یعنی مسلمانوں میں سے نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ و قتال کے ہتھیار اُٹھانا ایک ایسا فعل ہے جس کے کرنے کے بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

نسائی وابن ماجہ نے بطریق عمار ذہبی روایت کی ہے۔ ایک شخص نے ابن عباس سے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا۔ لقد نزلت فی آخر ما نزل وما نسخها شئی حتی قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما نزل وحی بعد رسول اللہ" اس پر سائل نے کہا" افرأیت ان تاب وآمن وعمل عملا صالحا ثم اھتدی ؟ کہا وانٰی لہ التوبۃ والھدی یہ لفظ یحیی الحابر کا ہے۔ نسائی وابن ماجہ کے الفاظ بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ حاصل ان تمام روایات کا یہ ہوا کہ ابن عباس سورۂ فرقان کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں، اور اس بارے میں آخر تنزیل سورۂ نساء کی آیت فجزاءھم جھنم خالدًا فیھا اور اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل مسلم کے لیے توبہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت ابن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے قوی نظر آتا ہے۔

اوّل تو اس بنا پر کہ سورۂ نسأ کی آیت کا منطوق عدم قبولیت کے لیے ظاہر و نص ہے، خالدًا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور منطوق مفہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو۔ کما تقرر فی الاصول

ثانیاً یہ کہنا کہ سورۂ فرقان کی آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آیۂ فرقان مکی ہے اور آیۂ نسا مدنی، خود ترجمان القرآن اور حبر الامت یعنی ابن عباس شہادت دے رہے ہیں کہ نزلت فی آخر ما

وہ فجزاءہ جہنم خالدا فیہا الخ کے یہی معنی کرتے ہیں کہ "لا توبۃ لہ"
اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس
سے "الا من تاب" کی نسبت پوچھا گیا تو کہا "ھٰذہ مکیۃ نسختھا ایۃ مدنیۃ
التی فی النساء" یعنی اس آیت کو سورۂ نساء کی آیت من یقتل مومنا
نے منسوخ کر دیا۔ پس قبولیت توبہ پر اس سے استدلال نہیں ہو سکتا
مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے لما انزلت التی فی الفرقان قال
مشرکوا مکۃ قد قتلنا النفس و دعونا مع اللہ الٰھا اٰخر و اتینا
الفواحش۔ فنزلت الا من تاب، وامن الخ قال فھٰذہ لاولئک
واما التی فی النساء، فھو الذی قد عرف الاسلام ثم قتل مومنا
متعمدا فجزاءہ جہنم لا توبۃ لہ" یعنی جب سورۂ فرقان کی آیت،
والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر ولا یقتلون النفس اتری تو
مشرکین مکہ نے کہا۔ ہم تو سب کام کر چکے ہیں۔ اب مسلمان ہوئے بھی
تو نجات کب ملے گی ؟ اس پر آیت اتری کہ الا من تاب وامن یعنی
ہاں۔ لیکن جس شخص نے توبہ کی، ایمان لایا، اچھے کام کیے، تو اللہ اس کی
برائیوں کو محو کر دے گا۔ لیکن من یقتل مومنا والی آیت مشرکین کے
لیے نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لیے اتری ہے۔ یعنی جو شخص مسلمان ہوتے
کے بعد مسلمان کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے
توبہ نہیں۔ انتہی۔

اور امام احمد و طبرانی نے سالم بن ابی الجعد سے بطریق یحیی الجابر، اور

الا من تاب و امن" ہاں جو لوگ مسلمان ہو جائیں تو انہوں نے کفر کی حالت میں اس طرح کے جس قدر افعال کیے ہوں ان کا مؤاخذہ نہ ہوگا۔ اسلام ان کی برائیوں سے آلودہ زندگی کو نیکیوں اور خوبیوں سے بھر دے گا۔

پس اس آیت میں توبۂ کفر کی قبولیت کا ویسا ہی حکم ہے جیسا صدہا مقامات میں وارد ہے۔ اس کو مسلمان قاتل مسلم اور مرتکب حمل سلاح علی المسلم کے معاملہ سے کیا تعلق؟ اور اگر اس کا ذکر کسی دوسری آیت میں آیا ہے تو کیوں ناسخ و منسوخ ہونے کی ضرورت پیش آتے؟ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں۔

لیکن سورۃ نساء میں قتل نفس کی ایک خاص حالت کا ذکر ہے اگر ایک مسلمان باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو قتل کر ڈالے تو اس کا کیا حکم؟ فرمایا جزاءہ جهنم خالدا فيها چنانچہ اس آیت سے پہلے ہے وما كان لمؤمن ان يقتل مومنًا الاخطأً الخ پس زیادہ سے زیادہ دونوں آیتوں میں عام میں خاص کا تعلق ہے۔ یعنی اس آیت نے آیتِ فرقان کی تخصیص کردی اسی لیے حضرت ابن عباس نے کہا نسختها اية مدنية فى النساء کیونکہ سلف کی اصطلاح "نسخ" کا اطلاق ہر طرح کی تخصیص و تقیید پر ہوتا تھا۔ وہ معنی نہ تھے جو بعد میں اصولیوں نے قرار دیئے اور اسی اختلاف حالت و حکم کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے کہا" فهذه و تلك یعنی آیت فرقان میں حکم کفار کے لیے ہے۔ اور امام بخاری کی روایت ابن جبیر بطریق شعبہ مندرجہ کتاب التفسیر میں کہا: كانت هذه فى الجاهلية "یہ حکم مشرکین

نزول وما ننسخها شئی" اور معلوم ہے کہ ناسخ کے لیے تقدم زمانی ہونا ضروری ہے۔

ثالثاً دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے کہ متاخرین کا مصطلحہ نسخ مانا جا سکے۔ دونوں کا مورد الگ الگ ہے۔ لیکن اگر نسخ ہو سکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ابن عباس نے کہا۔ یعنی عام و خاص کا نسخ۔ سورۂ فرقان میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ "الایمان یهدم ما قبلہ" ہے یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کر دیتا ہے اس لیے جب شرک سے توبہ ہو سکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہ ہو؟ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ "الا من تاب" کے بعد "و امن" کا لفظ بھی موجود ہے" یعنی توبہ کی اور ایمان لایا جس سے واضح ہو گیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے، نہ کہ ایک مومن کی توبہ معصیت بعد از اسلام، سورہ فرقان کا آخری رکوع "عباد الرحمن" سے پڑھو تو تمام آیات کا ٹھیک ٹھیک محل و مورد واضح ہو جاتے گا۔ وہاں ذکر خدا کے نیک بندوں کے اسلامی و ایمانی اوصاف کا ہے۔ انہی میں ان اوصاف کو بھی داخل کیا ہے کہ نہ تو شرک کرتے ہیں، نہ کسی نفس کو قتل کرتے ہیں، نہ زنا کا ان سے ارتکاب ہوتا ہے۔ پھر بتلایا ہے کہ مسلمان جن برائیوں سے بچتے ہیں؟ یہ وہ برائیاں ہیں جن کا نتیجہ عذاب جہنم ہے اس کے بعد فرمایا:

یعنی تمام گناہ اللہ بخش   سکتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو حالتِ کفر میں مرے
یا وہ جس نے جان بوجھ کر مومن کو قتل کر ڈالا۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں وسعت رحمت وعموم عفو وبخشش، وعدم
جواز یاس وقنوط وغیرہ کا ذکر ہے، تو اس مذہب کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی
مثل تمام عموماتِ قرآن کے ہیں، جن کی تخصیص آیۂ نساء اور اس کی مؤیدات فی السنت
نے کر دی۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ قبل از اسلام معاصی کی بخشش تو مسلم
ہی ہے۔ بحیث بعد از اسلام ارتکابِ قتل میں ہے۔ اسی طرح اگر حدیث
اسرائیلی الذی قتل تسعۃ وتسعین نفسًا ثم اتی تمام المائۃ ثم
تاب" پیش کی جائے تو جواب یہ ہوگا کہ اس کا محل بھی توبۂ اسلام ہے
نہ کہ توبۂ مسلم اور وہ بھی مثل عموماتِ بشارات رحمت وبخشش کے ہے۔
مخصصات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرضکہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن عام طور پر علماء نے
دوسرے مذہب کو اختیار کیا۔ یعنی قبولیت توبہ کو۔ اور خوارج ومعتزلہ
کے غلو کی وجہ سے اہل سنت کا رجحان اسی طرف بڑھتا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ
ایسے شخص کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے۔ لیکن توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ اللہ
کے ہاتھ میں ہے۔ چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے۔ اس میں شک نہیں کہ
عتبارِ حکم امید ہی میں ہے، نہ کہ پیام یاس وقنوط میں۔ ان اللہ لا یغفر
ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشآء کے حکم کا عموم بڑا ہی امید
افزا ہے اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے، تو کچھ شک نہیں کہ دوسرا مذہب

جاہلیت کے لئے تھا نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

اور یہ جو انہوں نے کہا کہ والذین لا یدعون مع اللہ الہا اخر و لا یقتلون النفس الخ کے نزول پر مشرکین مایوس ہو گئے تھے۔" الا من تاب" اتری، تو اس کی تائید مفسرین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ" نزلت فی قوم ییسوا من التوبۃ" یعنی ان لوگوں کے حق میں اتری جو زمانہ کفر کی بدعملیوں کی بخشش سے مایوس ہو گئے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت اور سورۃ نساء کی ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء اور سورہ زمر کی یہ آیت رحمت یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ الخ وحشی قاتل حمزہ کے بارے میں اتریں۔ وہ کہتا تھا کہ شرک میں ساری عمر کٹی، پیغمبر کے چچا کو قتل کیا۔ فواحش میں مبتلا رہا۔ انہی تین برائیوں سے اجتناب کا خاص طور پر آیت فرقان میں ذکر ہے اب اگر میں مسلمان بھی ہو گیا تو کیا فائدہ؟ مجھے تو نجات مل ہی نہیں سکتی اس پر الا من تاب و امن اتری، اور پھر مزید بشارت امید کے لیے سورۃ نسا اور سورۃ زمر کی آیات نازل ہوئیں۔ تعجب ہے کہ بعض شارحین بیت کو مذہب ابن عباس کی شرح و تطبیق میں مشکلات کیوں پیش آئیں؟ ان کا بیان تو بالکل صاف اور واضح ہے۔

رابعاً احادیث سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً امام احمد و نسائی کی روایت معاویہ بطریق ادریس خولانی مرفوعاً" کل ذنب عسی اللہ ان یغفرہ الا الرجل یموت کافراً اولرجل یقتل مومنا متعمداً

اشد حالت جس سے کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے وُہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں جو ایک مسلمان جسم دنیا میں کر سکتا ہے، یا ان کا وقوع دھیان میں آ سکتا ہے۔ سب اس کے آگے ہیچ ہیں جو مسلمان اس کا مرتکب ہو وہ قطعًا کافر ہے، اور بدترین قسم کا کافر۔ اس حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتلِ مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنانِ حق کی اعانت و نصرت کی ہے اور یہ بالاتفاق و بالاجماع کفر صریح و قطعی مخرج عن الملت ہے۔ جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقۂ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی، تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے؟

واقعۂ امام حسینؑ علیہ السّلام

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر سلطانِ اسلام کو خلیفہ مان لینا چاہیئے گو نااہل ہو، تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید بن معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں خروج کیا؟ اور کیوں ان کو برسرِ حق اور شہید

ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔

(۲) قتلِ مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم و متأسف نہ ہو۔ مثلاً کوئی مسلمان فوجی ہو۔ وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہی ہے۔ مسلمان سامنے ہوں گے تو انہی سے لڑیں گے۔ یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں، یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا یہی حکم ہے۔ ہم نے ان کا نمک کھایا ہے اس لیے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کر دو۔ تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تو اس صورت میں تمام امت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً و حتماً کافر ہے یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار و مشرکین کا ہے دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار رکھے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ یہ حکم خاص اس مسئلہ پر موقوف نہیں ہے۔ ہر محلّل حرام غیر ماؤل کے لیے یہی حکم ہے۔

(۳) تیسری صورت قتل مسلم کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لیے مسلمانوں سے لڑے، یا لڑائی میں اُن کی اعانت کرے اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے۔ یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی

اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، ایک بہت بڑی مرکزی و مؤثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب و سوال کو منظور کر لیا۔ البتہ اس منظوری میں یہ مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نااہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے۔

اگر کہا جائے کہ امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شئی نہیں ہے اصلی شرط خلافت کی انعقاد حکومت ہے یزید کو گو ولی عہد مقرر کر دیا ہو لیکن جب تک اس کی خلافت بالفعل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجت نہ تھی یہی وجہ ہے کہ جب یزید کی ولی عہدی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیعت طلب کی گئی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا "لا ابایع لامیرین" میں دو امیروں سے بیک وقت بیعت نہ کروں گا۔ یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں ولی عہدی کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے جس کی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ (رواہ ابن حبان و نقلہ فی الفتح)

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے تو یکایک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کر چکے ہیں اور سر زمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملۂ خلافت سے دستبردار ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا وہ اس پر بھی آمادہ

ظلم و جور تسلیم کیا جاتا ہے؟

پس گو بحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں مخل ہو گا۔ لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس لیے صاف کر دینا ضروری ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسین اس حالت میں لڑے، جبکہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے، جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے واقعۂ کربلا کا وقت نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں۔ حضرت امام جب مدینہ سے چلے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ جب کربلا میں حق پرستانہ لڑ کر شہید ہوئے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ دونوں حالتیں مختلف ہیں اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف۔

جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی نہ اہم مقامات و مراکز نے اس کو خلیفہ تسلیم کیا تھا۔ نہ اہل حل و عقد کا اس پر اجماع ہوا تھا۔ ابتدا سے معاملۂ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے۔ پھر حضرت علی کے زمانہ میں مدینہ کی جگہ کوفہ دارالخلافہ بنا۔ اہل مدینہ اس وقت تک متفق نہیں ہوئے تھے۔ کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی یک قلم مخالف تھی اور حضرت امام حسین سے بیعت کرنے کے لیے پیہم اصرار و الحاح کر رہی تھی۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہو چکا تھا

شرطِ قرشیّت

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انتخابِ خلیفہ و امام کے لیے متعدد شرطیں ہیں۔ ازاں جملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندان قریش میں سے ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر امت کے لیے انتخاب کا موقعہ باقی نہ رہا ہو تو خلیفہ تسلیم کر لینے کے لیے بجز اسلام اور استقرارِ حکومت (یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے) کے اور کوئی شرط نہیں ہے۔ خلفاء راشدین کے بعد جامع الشروط سلسلۂ خلافت کوئی بھی قائم نہ ہوا۔ بنو امیہ و عباسیہ میں اگر ایک شرطِ قرشیت کی پائی جاتی تھی تو اور بہت سی اہم شرطیں مفقود تھیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب و اجماع سے ہو۔ سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی۔ پھر خلیفہ کو عادل و منصف ہونا چاہیئے۔ حکومت نظامِ شوریٰ کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین پر عمل کرنا چاہیئے۔ بجز عمر بن عبدالعزیز کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا۔ عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی۔ پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا۔ آخری مصری خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خلافت بلا نزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کے لیے شرع و امت کا مرکزی اقتدار ہے۔ اگر بنو امیہ و عباسیہ میں پانچ

ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کر لیں۔ مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں یا اپنے تئیں مع اہل وعیال قید کرا دیں یا مردانہ وار لڑ کر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرا دے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمۃ دعوت کی اختیار کی اور خود فروشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدانِ کارزار گرم ہوا ہے اس وقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے، نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے ان کی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جس کو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو زندہ گرفتار کرا دینا پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ طاقتور ظلم کے مقابلے میں بے سروسامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظرِ دنیا کو دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے۔ جس کو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب وخاندان کا ہو، لیکن اگر خلیفہ ہو گیا ہے تو اطاعت کرو، اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے۔ اگر کسی امام نے مقرر کر دیا ہو یا خود وہ شہروں پر غالب آکر مستلط ہو۔ البتہ جائز نہیں کہ ابتداء میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جاتے۔ کیونکہ آزاد ہونا شرائط امامت میں سے ہے۔ اور فتح الباری میں ہے "لو تغلب حقیقة بطریق الشوکة، فان طاعته تجب اخمار للفتنة"

جب غلبہ وتسلط کی صورت میں خود حافظ نواوی (جو شرط قرشیت کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ہیں) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دفی النسب، حبیس الحال حبشی غلام امیر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے۔ تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب ومسلط خلیفہ کی خلافت کے لیے شرط قرشیت کا موجود نہ ہونا کیوں مخل ہو۔ اگرچہ قرشیت ایک شرط ابتدائی مان لی جائے!

پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے ترکان عثمانی کی خلافت مسلمہ ومنعقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یک قلم غیر متعلق ہے۔ تاہم تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہوگا کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر ڈالی جائے۔

شرطیں نہیں پائی جاتیں تھیں۔ تو ان میں سات نہ سہی۔ یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں۔ لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم و نافذ خلافت کے ماننے کا، اس لیے شرائط کی بحث کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

منجملہ شروط خلافت کے ایک متفق علیہ شرط حریت کی ہے یعنی خلیفہ آزاد ہو۔ غلام نہ ہو۔ مصلحت و ضرورت بھی اس کی ظاہر ہے مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے، کہ غلاموں نے امامت کی ہے، پادشاہت کی ہے، اور تمام سادات و قریش اور شرفاء عرب و عجم نے ان کے آگے اطاعت کا سر جھکایا ہے۔ خود حدیث میں وارد ہے اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسه زبیبة اور روایت ابوذر عند مسلم کہ " و ان کان عبدا مجدع الاطراف اور روایت ابن حصین کہ " ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب الله، اسمعوا له و اطیعوا یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو جائے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔ حافظ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں " والمراد اخس العبید، ای اسمع واطیع وان کان و فی النسب حتی لو کان عبد اسود مقطوع الاطراف، فطاعته واجبة، ویتصور امارة العبد اذا ولاه بعض الائمة، او یغلب علی البلاد بشوکة واتباعه ولا یجوز ابتداء عقد الولایة له مع الاختیار، بل شرطها الحریة " (جلد ۲ : ۱۲۵) یعنی یہ جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو تو مقصود اس کا یہ ہے

یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز نسب کے جس بُت کو خود اس نے توڑا ہو، انہی ٹکڑوں کو پھر جوڑ کر از سرِ نو ایک نیا بُت خانہ قائم کر جاتے۔

تفصیل و دلائل کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ہر اس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے۔ روشن ہے کہ ہر طرح کے نسلی و خاندانی امتیازات کے مٹانے میں اسلامی احکام و اعمال کا یہ حال رہا ہے۔ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جن کے غرورِ قوم و نسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک چرواہا اپنے نسبی و خاندانی شرف کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتا تھا۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی و وطنی امتیازات کی پرستش کر رہی تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرورِ نسل و قوم کے بُت پر لگائی۔ اور اللہ کے اس قانونِ فطرت کی عام منادی بلند کی کہ: یا ایہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی، و جعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم یعنی بنیاد ہر طرح کی بزرگی و فضیلت کی صرف عمل ہے، اور کوئی شئی نہیں، قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لیے ہے کہ باہم گر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو۔ اس لیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی بڑائی جتلاتے سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور فرمایا لا تزر وازرۃ وزر اخری، و ان لیس للانسان الا ما سعی و ان سعیہ سوف یری (۱۰)

ہر انسان اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے اور انسان کی تمام کامیابیوں اور سعادتوں کی بنیاد صرف اس کی کوشش اور اُس کا عمل ہے۔

الائمۃ من قریش

تحقیق امارتِ قریش و شرطِ قرشیّت

جہاں تک قرآن و سنت آثارِ صحابہ اور تمام دلائل شرعیہ و عقلیہ کا تعلق ہے کوئی نص قطعی موجود نہیں، جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملۂ خلافت و امامت صرف خاندان قریش کے لیے شرعاً مخصوص کر دیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں، سب صحیح ہیں، یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجمع صحابہ میں اس کو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی اور یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا، لوگ اس کو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے، بایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کی تمام قومی و نسلی امتیازات مٹانے اور ہمیشہ کے لیے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دینے اور "عمل" کے قانونِ الٰہی کے آخری اعلان کے لیے آیا تھا، اس کے نام سے ساری باتیں مان لی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔

ابیہ وقد کان لہا اھلا، وان اسامۃ لہا اھلاً۔" تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا، اور اب اسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے" "اہل" کے لفظ پر زور دیا۔ یعنی طعن بیکار ہے کیونکہ بنیاد معاملۂ امارت وسرداری کی صرف اہلیت وقابلیت ہے اور کچھ نہیں حضرت عائشہؓ کا قول مشہور ہے۔" لو کان زید حیا ما ستخلف رسول اللہ غیرہ۔" اگر آنحضرت کے غلام زندہ رہتے تو آپ ان کے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے۔[1] اسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی تھی جانتے ہو اس میں کیسے کیسے لوگ شریک تھے؟ بڑے بڑے مہاجرین وقریش اور سادات عرب، جن میں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ صدیق کا نام نظر آتا ہے۔ وہی ابو بکرؓ جو چند دنوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور تمام امت کے

---

[1] اے اللہ اللہ! اس بارے میں اسلام و پیروان اسلام کے معاملات کیسے عجیب وغریب رہ چکے ہیں؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں، کیونکر یاد دلایا جائے کہ کسی زمانے میں اللہ اور اس کے رسول کے رشتہ کے سوا نہ کوئی رشتہ مقبول تھا، نہ عمل کی بزرگی کے سوا کوئی بزرگی تسلیم کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ انہی اسامہ کی نسبت ناقابل فراموش ہے۔ ان کے لڑکے عبداللہ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال میں اسامہ بن زید سے مجھے کم درجہ پہ کیوں رکھا جاتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا" کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابیک وکان احب الی رسول اللہ منک۔" اس لیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اس کا باپ اللہ کے رسول

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زندگی بھر کا قول وفعل یہ رہا کہ "لیس منا من دعی الیٰ عصبیۃ" اور لیس منا من قاتل علی عصبیۃ اور لیس منا من مات علی عصبیۃ" یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جاتے وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی بنا پر لوگوں سے جنگ کرے ا دنیا کو چھوڑنے سے پہلے، حجۃ الوداع میں جو آخری پیام امت کو سنایا، اس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی۔ یعنی نوعِ انسانی کی عام مساوات کا اعلان: لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی کلکم ابناء آدم (ترجمان) اور فرمایا لیس لاحد فضل علی احد الا بدین وتقوی۔ الناس کلھم بنو آدم، وآدم من تراب (رواہ الجماعۃ)

یعنی اسلام کا ظہور و قیام نوعِ انسانی کی مساوات اور باہمدگر برابری کا اعلان ہے۔ اب نہ کسی عرب کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عرب پر ملک و قوم کی وجہ سے فضیلت مل سکتی ہے۔ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور ہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہے

معمورۂ دے اگرت ہست باز گوئے
کین جا سخن بہ ملکِ فریدوں نمی رود

عملاً یہ حال تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں سب سے آخری فوجی مہم جو بھیجی۔ اس کی سرداری اسامہ کو دی جن کے والد زید آپ کے غلام تھے۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا" لقد طعنتم فی امارۃ

نبوت میں سے ہے! اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسلی عصبیت کا نام و نشان باقی نہ رہا، اور وہ زمانہ آگیا۔ جب بزرگی و فضیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی عرب ان کے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھک گئے تھے جس طرح ایک قریشی و ہاشمی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو امام زہری سے کہنا پڑا: واللہ یسودن الموالی العرب ویخطب لہم علی المنابر، والعرب تحتہم (عقد الفرید)

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کے لیے بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا داعی تمام دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور مساوات عامہ کی طرف بلا رہا ہو لیکن (نعوذ باللہ) خود اس درجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کے لیے بادشاہی و خلافت صرف اپنے ہی خاندان کے لیے مخصوص کر دے؟ وہ تمام نوع انسانی سے کہے کہ تمہارے سارے بناوٹی حق جھوٹے ہیں۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے۔ لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت۔ بلکہ صرف ملک، صرف قوم، صرف نسل اور صرف خاندان؟

کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟

خیر یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی لیکن ہم بلا تامل باور کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت سے ٹھیک ٹھیک ثابت ہوتی۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے

امیر ہونے والے ہیں۔

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی (رضی) کا جو حال تھا معلوم ہے۔ بلال کو عمر فاروق جیسے قرشی نے "ہمارا آقا و سردار" کہا۔ اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے: "نعم العبد صہیب! لو لم یخف اللہ لم یعصہ" صہیب اللہ کا کیا نیک بندہ ہے! اگر خوفِ عذاب نہ ہوتا جب بھی اس کی فطرت بدی پر مائل نہ ہوتی مرنے کے وقت وصیت کی کہ نماز جنازہ وہی پڑھائیں سلمان کا یہ حال تھا، کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے "سلمان منا اھل البیت" سلمان تو ہم اہل بیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) کو پیارا تھا۔ اور اس لیے کہ وہ خود بھی تجھ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک محبوب تھا۔ یعنی بتا دیے استحقاق ہماری آپس کی رشتہ داریاں نہیں ہو سکتیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک جو محبوب ہو وہی سب سے زیادہ حقدار ہے اور اسی کو ہر طرح کی بڑائی پہنچتی ہے۔ ایسے صدہا واقعات ان عہدوں میں گزر چکے ہیں۔ اسلام نے یہ انقلاب اس ملک میں پیدا کر دیا تھا جہاں کا بچہ بچہ غرورِ نسل وخاندان کے نشہ میں بدمست رہتا تھا۔ جو مغرور قریش کل تک قبائل یثرب کے شرفا کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں ان سے مقابل ہوں، وہ اب غلاموں اور غلام زادوں کی سرداری بھی مان لینے کے لیے بلا چون وچرا تیار ہیں۔ سلطانِ اسلام کے لڑکے کے استحقاق پر ایک غلام زادہ کو ترجیح دی جا رہی ہے، وہ گردن جھکا دیتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے۔

عن ابی هریرۃ "الناس تبع لقریش فی ھٰذا الشان مسلمھم لمسلمھم وکافرھم لکافرھم (مسلم) دوسرے طریق زیادہ وضاحت ہے "مسلمھم تبع لمسلمھم، وکافرھم تبع لکافرھم" (مسلم) جابر کی روایت میں "الناس تبع لقریش فی الخیر والشر" ہے۔ امام نواوی اس کی شرح میں لکھتے ہیں "معناہ فی الاسلام والجاھلیۃ لانھم کانوا فی الجاھلیۃ رؤساء العرب واصحاب حرم اللہ واھل الحج، وکانت العرب بنتظر اسلامھم، فلما اسلموا وفتحت مکۃ تبعھم الناس، وجاءت وفود العرب من کل جھۃ ودخل الناس فی دین اللہ افواجا (جلد ۲: ۱۱۹)

پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کو مسئلہ خلافت کے اختصاص و شرائط سے کوئی تعلق نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی ہمسائیگی کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا، اور ہر کام میں سب کی نظریں اسی پر اٹھتی تھیں۔ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اور قریش مسلمان نہ ہوتے تمام عرب کے قدم رُکے رہے۔ جونہی قریش مسلمان ہوتے، سب نے ان کی پیروی کی اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیئے حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا پس فرمایا: "الناس تبع القریش" لوگ جاہلیت اور اسلام، دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوتے۔ وہ بگڑے رہے تو سارا عرب بگڑا رہا وہ سنورے تو سب سنور گئے اور یہ بالکل حق و معلوم ہے۔ ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر ملک و قوم پر ہوتا ہے۔ اچھی بُری ہر طرح کی باتوں میں لوگ انہی کی پیروی کرتے ہیں حضرت ابوبکر کی روایت سے یہی حدیث مسند امام احمد میں یوں مروی

بطریق صحیح ثابت ہو۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہماری نارسا سمجھ اس کا احاطہ و ادراک بھی کر سکے۔ لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلی و قیاسی استبعاد نہیں ہے یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں اور چونکہ ثابت نہیں، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ اسلام کے لیے کوئی ایسی بات بھی ثابت بھی نہیں ہونی چاہیے

شارع کے بیانات، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے واقع ہوتے ہیں۔ از انجملہ ایک صورت احکام و اوامر اور تشریع کی ہے یعنی بحیثیت شرح و دین کے کوئی حکم دینا اور قانون ٹھہرا دینا۔ دوسری صورت اخبار و اطلاعات کی ہے۔ یہ دوسری صورت مجرّد بیان واقعہ و حال ہے اور اگر آئندہ کی نسبت ہے تو پیشین گوئی ہے۔ حکم اور تشریع نہیں ہے یعنی صرف ایک خبر ہے کہ ایسا ہوگا یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیئے۔

قریش کی خلافت کی نسبت جس قدر روایات موجود ہیں، سب دوسری قسم میں داخل ہیں نہ کہ پہلی قسم میں اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے

(۱) یہ حدیث ابو ہریرہ، ابو برزہ، کثیر بن مرہ، جابر بن عبداللہ، جابر بن سمرہ، معاویہ بن سفیان وغیرہم مختلف صحابہ سے مروی ہے، اور عمدہ طرق وہ ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں۔ لیکن کسی طریق و روایت میں بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا تشریح و امر تھا۔

طریق سے اس پر زیادت کی " لا تضرھم عداوۃ من عاداھم " بعض طریق میں ہے " لایزال ھذا الامر صالحا " اور ما ضیا ز رواھما احمد) اور بزار وطبرانی نے ابوجحیفہ سے روایت کی ہے " لایزال امر امتی قائما حتی یمضی اثنا عشر خلیفۃ کلھم من قریش " بھی روایت ابوداؤد میں اس اضافہ کے ساتھ ہے، فلما رجع الی منزلہ اتتہ قریش فقالوا ثم یکون ماذا؟ فقال ثم یکون الھرج " حاصل تمام روایتوں کا یہ ہے کہ آپ آئندہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں سب قریش سے ہوں گے۔ کسی دشمن کی دشمنی ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی جب تک یہ بارہ خلیفہ حکمران رہیں گے اسلام باعزت رہے گا اور لوگ خوشحال۔

اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کر دیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس سے صرف آئندہ کی نسبت اطلاع دینا مقصود ہے۔ حکم و تشریع نہیں ہے۔ ہم نے تمام روایات و طریق نقل کر دیئے۔ کسی روایت اور طریق سے بھی ایسا لفظ ثابت نہیں جس سے حکم و تشریع نکل سکے۔

(۳) ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جس کو امام بخاری نے باب " الامراء من قریش " کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھی جائے تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جائے گی۔ امیر معاویہ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبداللہ بن عمرو کہا کرتے ہیں: " سیکون ملک من قحطان " ان میں سے ایک بادشاہ ہوگا۔ امیر معاویہؓ یہ سن کر غضبناک ہوئے

ہے "بر الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم" اور بیہقی نے حضرت علی سے روایت کیا "کان ھٰذا الامر فی حمیر فنزعہ اللّٰہ منھم وجعلہ فی قریش" لیکن اس سے یہ بات کیونکر ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کا خلیفہ بجز اُن کے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا؟ اسلام صرف عرب ہی کا اسلام نہ تھا جس کے سردار قریش تھے اسلام تمام عالم کیلئے اسلام ہے جس کی ریاست وسرداری صرف علم وعمل حق ہی کو مل سکتی ہے اور یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے!

(۲) امام بخاری نے جابر بن سمرہ سے بطریق ایک اور حدیث روایت کی ہے "سمعت النبی صلعم یقول ان یکون اثنا عشر امیرا فقال کلمۃ لم اسمعہا فقال ابی انہ قال کلھم من قریش" یہ حدیث مختلف طریقوں اور لفظوں سے تمام اصحاب سنن ومسانید نے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں سفیان بن عیینہ کے طریق سے "لا یزال امر الناس ماضیا ما ولیھم اثنا عشر رجلا ثم تکلم النبی بکلمۃ خفیفۃ علی۔ فسئلت ابی ماذا قال؟ فقال کلھم من قریش اور حصین بن عمران کے طریق سے" ان ھٰذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیھم اثنا عشرۃ خلیفۃ" اور سماک بن حرب سے" لا یزال الاسلام عزیزا منیعا الی اثنا عشر خلیفۃ" مروی ہے۔ شعبی کے طریق عند ابی داؤد میں ہے فکبر الناس وضجوا" اور اسمٰعیل بن ابی خالد عن ابیہ سے اسی میں ہے لا یزال ھٰذا الدین قائما حتی یکون علیکم اثنا عشر خلیفۃ کلھم تجتمع الامۃ علیہ" طبرانی نے اسود بن سعید کے

قحطانی اور حدیث قریش میں تطبیق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارت قریش والی رعایت تشریع نہیں ہے محض خبر ہے اور وہ بھی "ما اقاموا الدین" کے ساتھ مقید۔ شیخ الاسلام لکھتے ہیں "ھٰذا انکار من معاویۃ بلا تامل، والا، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعًا، وما ذکر فی المعارضۃ، فھو حجۃ لما فیہ من التقیید بقولہ: "ما اقاموا الدین" اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے۔" الذی انکرہ معاویۃ فی حدیث ما یقویہ لقولہ ما اقاموا الدین فربما کان فیھم من لا یقیمہ فیتسلط القحطانی علیہ وھو کلام مستقیم" (۱۳ : ۱۰۲) یعنی امیر معاویہ کا انکار کر دینا ان کی بے غوری کا نتیجہ تھا۔ ورنہ قحطانی والی بات ثابت ہے۔ امیر معاویہ نے جو حدیث معاوضہ میں پیش کی اس کا آخری ٹکڑا خود انہی پر حجت ہے اور ابن عمرو کی تصدیق کر رہا ہے یعنی اس میں "ما اقاموا الدین" کی قید موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہیں گے جو دین قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی غیر قرشی مسلط ہو جائے گا۔

(۴) صحیح بخاری کے ترجمۂ باب سے واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ انہوں نے باب باندھا ہے۔ "الامراء من قریش" قریش میں امارت اور اُمراء۔ اس مضمون کا باب نہیں باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش میں ہونی چاہیئے۔

(۵) امام بخاری نے ایک دوسری روایت ابن عمر کی درج کی ہے۔

اور خطبہ دیا بلغنی ان رجلا منکم یحدثون احادیث لیست فی کتاب اللہ و لا توثر عن رسول اللہ الخ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں کہ نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسولؐ سے ثابت ہیں۔" انی سمعت رسول اللہ یقول ان ھذا الامر فی قریش، لایعادیھم احد الاکتبہ اللہ علی وجھہ ما اقاموا الدین۔" میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ یہ بات (یعنی حکومت) قریش ہی میں رہے گی جب تک وہ دین قائم رکھیں گے جو ان کی مخالفت کرے گا الٹا رسوا ہوگا یعنی کامیاب نہ ہوگا۔

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا۔ معلوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے یہ پیشین گوئی تھی اور حرف بحرف پوری ہوئی۔ یعنی آپ نے بتلا دیا تھا کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت رہے گی، حکومت انہی کے قبضے میں رہے گی۔ جو ان کے خلاف اٹھے گا ناکام رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہی۔ اسلامی خلافت کے وہی مالک رہے۔ جب اس کے اہل نہ رہے، عجم و ترک نے یہ بار اٹھا لیا۔ بحکم ان یشاء یذھبکم و یات بخلق جدید، وما ذالک علی اللہ بعزیز اور یستبدل قوما غیرکم الخ باقی رہا امیر معاویہؓ کا ابن عمرو پر انکار، تو یہ بھی صحیح نہ تھا، وہ صرف یہ بات سن کر گھبرا اٹھے، کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے، اصلیت پر غور نہیں کیا۔ قحطانی والی حدیث بطریق رفع ثابت ہے، اور قریش والی حدیث میں "ما اقاموا الدین" کی قید موجود ہے۔ پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ اسی بنا پر آئمہ حدیث نے حدیث

پس اگر ایک قرشی، فاطمی، عباسی، تن تنہا کسی ہنگامہ و قتال سے بچ کر نکل جاتا، تو جس گوشۂ عالم میں پہنچ جاتا، ایک عالم اس کے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا۔ گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی۔ ایک اموی شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہوکر یورپ جا پہنچا۔ وہاں پانچ صدیوں تک کے لیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ لیکن جب عرب و قریش کے تنزل اور ادبار کا وہ آخری وقت آگیا کہ وہ قرشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے، تو تاریخ خلافت نے معاً صفحہ الٹ دیا، اور یک قلم عربی و غیر قرشی خلافت کا دور شروع ہو گیا۔ و کان وعداً مفعولا:

(۴) اشتباہ و اضطراب کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں جب ترمذی کی وہ روایت سامنے آجاتی ہے جس میں امارت قریش کے ساتھ دو اور باتوں کا بھی ذکر ایک ہی سلسلے اور ایک ہی اسلوب میں کیا گیا ہے۔ اور گویا روایت امارت کے متن کا وہ ایک متمم و مکمل ٹکڑا ہے جو بقیہ طرق میں رہ گیا تھا، اس طریق میں مل جاتا ہے تاکہ اس کو جوڑ کر مضمون حدیث کامل کر لیا جائے۔ قریش والی حدیث اگرچہ مختلف راویوں سے مروی ہے، لیکن سب سے زیادہ اور مشہور طرق ابو ہریرہ، جابر بن سمرہ، اور ابن عمر پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور امام مسلم، احمد، ابو داؤد طیالسی بزار، طبرانی کے تمام طریق تو حضرت ابو ہریرہ رضی کی روایت سے نکلے ہیں۔ انہی ابو ہریرہ سے بطریق ابو مریم

جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے "لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی منھم" یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہے گی جب تک دو آدمی بھی ان میں باقی رہیں گے اس روایت سے ہمارے بیان کی اور مزید تصدیق ہو گئی۔ حدیث کا منطوق صریح پیشین گوئی کا ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی، تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ دو کی جگہ ہزاروں قریشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی۔ پس ضرور ہے کہ "ما بقی منھم اثنان" کے منطوق پر مفہوم کو ترجیح دی جائے اور وہ یہی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہیں گے، جو خلافت کے اہل ہوں گے تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہو گا۔ مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آ جائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں تو مشیت الٰہی اپنے قانون انتخاب اصلح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرما دے گی اور قریش خلافت سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ معتصم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کے لیے رہ گیا تھا۔ تاہم اقتدار خلافت انہی کا رہا۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دعویٰ کر سکے۔ کیسی کیسی طاقتور اور باجبروت عجمی اور دیلمی حکومتیں قائم ہوئیں، لیکن سب اپنا بڑا سے بڑا شرف یہی سمجھتے تھے کہ مقام خلافت سے انہیں خدمت و یاوری خلافت کا کوئی لقب مل جاتے، اور

نسبت خبر ہے کہ حکومت قریشیوں کے ہاتھ میں رہے گی۔ قضا پر انصاری مامور ہوں گے اور اکثر ایسا ہوگا کہ موذن حبشی ہوں، کوئی خاص آنے والا عہد پیش نظر ہوگا اسی کی نسبت یہ خبر آپ کی زبان مبارک پر جاری ہوگئی۔

(۷) اس حدیث کے جو متون و اسناد صحیحین نے اختیار کیے ہیں۔ اُن کے بعد سب سے زیادہ مشہور روایت وُہ ہے جس کو ابو داؤد طیالسی، امام احمد ابو یعلی، طبرانی وغیرہم نے حضرت ابو برزہ اور انس سے روایت کیا ہے۔ الائمۃ من قریش ما حکموا فعدلوا ووعدوا، فوفوا، وسترحموا اور طبرانی نے حضرت علی سے مرفوعاً روایت کیا ہے الا ان الامراء من قریش ما اقاموا ثلاثا الخ اسی متن کو امام بخاری نے تاریخ میں اور طیالسی و بزاز نے مسند میں حضرت انس سے یوں بھی روایت کیا ہے۔ الائمۃ من قریش ما اذا حکموا فعدلوا، نسائی و حاکم نے بھی ایک دوسرے طریق سے یہ روایت لی ہے۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ فرمایا امراء اور ائمہ قریش میں سے ہیں۔ جب تک ان میں عدل گستری ایفاء عہد اور رحم و شفقت کے اوصاف باقی رہیں گے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ قریش کی خلافت اہلیت و صلاحیت کے ساتھ مشروط تھی۔ یعنی پہلے ہی سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک صفات حسنہ ان میں باقی رہیں گے، خلافت انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہ بات نہ تھی کہ تشریعاً ہر حال میں خلافت کو انہی کا حق بتلایا ہو۔

(۸) اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بعض روایات میں قریش کی نسبت

انصاری ترمذی نے روایت کیا ہے: "الملك فی قریش والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشة (اسناد صحیح) اور امام احمد کثیر بن مرہ سے یوں روایت کرتے ہیں: "الخلافة فی قریش والحکم فی الانصار والدعوة فی الحبشة" (رجاله موثقون وایضا رواه الطبرانی والبزار من وجه اخر)

اس روایت میں ایک ساتھ تین باتوں کا ذکر ہے۔ خلافت قریش میں قضا وحکم انصار میں، اذان ودعوۃ اہل حبش میں۔ پس جو معنی ایک بات کے ہوں گے وہی یقینہ دو کے ہوں گے اور جو مطلب دو باتوں کا ہوگا وہی پہلی بات کا بھی ہوگا۔ اگر پہلی بات (یعنی قریش کی حکومت) بیان حال اور پیشین گوئی نہیں ہے امر وتشریع ہے تو لقیہ دو جملوں کو بھی امر وتشریح قرار دینا پڑے گا۔ یعنی ماننا پڑے گا کہ قاضی ہمیشہ انصار ہی ہونا چاہیئے اور موذن بجز حبشی کے دوسرا ہو نہیں سکتا۔ لیکن معلوم ہے کہ آج تک نہ کسی نے ایسا کہا، نہ یہ مطلب سمجھا، نہ قضاء واذان کے لیے کوئی شرعی اشتراط ملک ونسل کا تسلیم کیا گیا ہے۔

پس جو مطلب اُن دو باتوں کا ہے، وہی خلافت قریش کا بھی ہے۔ یا تو یہ بیان حال ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسا ہُوا۔ آپ خود قرشی تھے اور مسلمانوں کے امیر ورئیس کل قضاء پہ اکثر انصار مامُور ہوئے اور اذان حضرت بلال دیتے تھے۔ پس "الملك فی قریش، والقضاء فی الانصار والاذان فی الحبشة" کی تقسیم ہوگئی تھی یا آئندہ کی

سے خبر دیدی گئی ہے کہ ہمیشہ خلافت انہی میں رہے گی۔ چنانچہ حرف بحرف یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اور قریش پر یکے بعد دیگرے ایسے لوگ مسلط ہوئے۔ جنہوں نے ان کا سارا زور توڑ دیا۔ حتی کہ حکومت قریش کا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لایخبر عن شئی، للاوجاء مثل فلق الصبح

(۹) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے خلافت کو قریش میں مخصوص ثابت کرنا چاہا۔ ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ان تمام روایات کا منطوق خبر کا ہے نہ کہ امر کا۔ اور کوئی حدیث ایسی قوی ظاہر الدلالت موجود نہیں جس سے ان کا مدعا ثابت ہو سکے۔ وہ مجبور ہوئے ہیں کہ انہی احادیث کو تاویل و توجیہ کرکے امر پر محمول کریں۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی کی نسبت لکھا ہے: کانہ جنح الی انہ خبر بمعنی الامر" اور ابن منیر نے کہا: والحدیث و ان کان بلفظ الخبر فھو بمعنی الامر کانہ قال ائتموا بقریش خاصۃ ایضاً پس اس پر سب متفق ہیں کہ الفاظ حدیث میں صورت خبر کی ہے۔ امر کی نہیں اور جب دلیل قوی و ظاہر موجود نہیں۔ نہ قرآن میں، نہ سنن میں نہ اقوال صحابہ میں، تو پھر کیا مجبوری پیش آئی ہے کہ تاویلات اختیار کی جائیں اور نص کو بلا وجہ ظاہر و منطوق سے مصروف کیا جائے۔

(۱۰) اس حدیث کی تمام روایات و طرق پر ہم نے نظر ڈال لی اب صرف دو روایتیں اور رہ گئیں جو مناقب قریش میں آئی ہیں اور جن سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے۔ بیہقی و طبرانی نے جبیر بن مطعم اور ابن سائب سے روایت

بصورت ظلم و جور عدم اتباع شریعت، سخت کلمات وعید بھی آتے ہیں۔ حتیٰ کہ کلمہ "لعن" بھی آیا ہے۔ یہ بھی صاف صاف موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنتِ عادلہ کے مطابق ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا، جن کا تسلط ان کے لیے سخت اذیت و عقوبت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ طبرانی کی سابق الذکر روایت "ثُمَّ اَقَامُوْا ثلاثًا" میں یہ بھی ہے "فمن لم یفعل ذالک فعلیہ لعنۃ یعنی تین وصف عدالت، ایفائے عہد اور رحم و شفقت کا بیان کرکے فرمایا۔ اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس پر اللہ کی پھٹکار اور احمد و ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود سے مرفوعًا روایت کیا" یا معشر قریش! انکم اھل ھذا الامر مالم تحدثوا، فاذا غیرتم، بعث اللہ علیکم من یلحاکم کما یلحی القضیب" رجالہ ثقات الا انہ من روایۃ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، عن عم ابیہ عبد اللہ ابن مسعود، ویدارکم وایضا اخرجہ احمد عن ابی مسعود الانصاری من طریق عبید اللہ وفی سماعہ نظر، ولہ شاھد من مرسل عطا بن یسار۔ اخرجہ الشافعی والبیھقی بسند صحیح" یعنی اسے جماعت قریش! جب تک تم کوئی نئی روش اختیار نہ کرو تم ہی اس بات کے اہل ہو۔ لیکن اگر تم نے اپنی حالت بدل دی تو یاد رکھو اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم کو چھڑی کی طرح موڑ دیں گے۔

پس ان روایات سے دونوں باتوں کی مزید تصدیق ہو گئی۔ اوّل یہ کہ خلافتِ قریش کے تمام بیانات محض خبر ہیں، تشریع و امر نہیں۔ ثانیًا پہلے

فی سندہ انقطاع"

ثانیاً، اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے، اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑا ہے جو دوسرے طریقوں سے صریح پیشین گوئی کے لفظوں میں پڑھ چکے ہو۔ حضرت ابوبکر نے یہ بات اس لیے پیش کی تھی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دے دی گئی ہے۔ پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے خلاف بات نہ اٹھاؤ۔ یہ سن کر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا۔

ثالثاً "الناس تبع لقریش" والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں ان کی ریاست و سرداری سے نہ تھا نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے۔ وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمادیا ہے جاہلیت اور اسلام دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہیں گے، اس لیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو پوری طرح کھول دیتا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا "ان العرب لا تعرف ھٰذا الامر لغیر ھٰذا الحی" یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا۔ صرف ملکی و وقتی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیئے جس کی سرداری عرب کے

کیا۔ "قدموا قریشًا ولا تقدموھا" یعنی قریش کو مقدم رکھو یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ قریش کو ہر بات میں آگے رکھو۔ خود پیچھے رہو لیکن قطع نظر قوت و ضعیف روایت کے، اس سے بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ قریش کے سوا دوسرے کی خلافت جائز نہیں۔ قریش کو عرب میں ہر طرح تقدیم در ریاست حسب عمل تھی۔ لوگ ان کی ریاست سے متاثر تھے۔ پس فرمایا کہ اس بات کا لحاظ رکھا کرو۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ امامت و خلافت کے حق دار ہمیشہ قریش ہی ہیں؟

دوسری روایت امام احمد نے عمرو بن العاص سے روایت کی ہے آنحضرت نے فرمایا "قریش قادۃ الناس" قریش لوگوں کے سردار ہیں۔ لیکن اس کو بھی اختصاص خلافت کے سوال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ سردار قوم تھے لیکن اس کا حکم کہاں ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ صرف انہی میں سے ہو سکتا ہے کیا ایک ایسے اہم مسئلہ کے لیے اس طرح کی باتیں نفی کا کام دے سکتی ہیں؟

(۱۱) باقی رہی حدیث الائمۃ من قریش" اور یہ استدلال کہ حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں برخلاف انصار پیش کی اور سب نے تسلیم کر لیا تو اس سے بھی شرعًا اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اوّلًا یہ الفاظ اور حضرت ابوبکر والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں۔ فتح الباری میں ہے "الائمۃ من قریش رجالہ رجال الصحیح لکن

صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے، بلکہ اس کے خلاف شواہد موجود ہیں۔ امام احمد نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے۔ اگر معاذ بن جبل میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بناؤں گا۔ یہ ظاہر ہے کہ معاذ قریشی نہ تھے۔ انصار مدینہ میں تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت شرط نہ ہوتی تو حضرت عمر جیسا محرم اسرارِ خلافت کیونکر ان کی خلافت کا تصور بھی کر سکتا تھا۔ مسند امام احمد میں حضرت عمر کا ایک اور قول بھی ابو رافع کی روایت سے موجود ہے۔" لو ادرکنی احد رجلین ثم جعلت ھذا الامر الیہ لوثقت بہ سالم مولی حذیفۃ وابو عبیدۃ الجراح " اگر سالم مولیٰ حذیفہ اور ابو عبیدۃ الجراح میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اس کے سپرد کر دیتا، تو مجھے اس بارے میں پورا اطمینان و اعتماد ہوتا۔ اگر حضرت عمر صدہا صحابہ و مہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولیٰ حذیفہ کو خلافت سپرد کر دینے کا ارادہ کر سکتے ہیں۔ تو پھر کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں مل سکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس بات کا خود آئمہ متاخرین کو اعتراف کرنا پڑا۔ حافظ ابن حجر قاضی عیاض کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں" قلت ویحتاج من نقل الاجماع الی تاویل ما جاء عن عمر من ذلک۔ فقد اخرج امام احمد عن عمر بسند رجالہ ثقات ان ادرکنی اجلی الخ الی ان قال فیحتمل ان یقال لعل الاجماع انعقد بعد عمر علی اشتراط ان یکون

تمام قبائل بلا چون وچرا تسلیم کرلیں؟

رابعاً یہی روایت بعض دیگر طرق سے صاف صاف خبر کی صورت میں آئی ہے۔ امر وتشریع کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ ابن اسحاق نے کتاب الکبیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابو بکر نے سقیفہ کے مجمع میں فرمایا۔ "ان ھٰذا الامر فی قریش ما اطاعوا اللہ واستقاموا علی أمرہ" (فتح ۱۳: ۱۰۳) یعنی یہ بات قریش میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کریں گے اور اس میں مستقیم رہیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ امام احمد والی روایت میں راوی نے بقیہ ٹکڑ چھوڑ دیا ہے۔ صرف "الائمۃ من قریش" لے لیا ورنہ حضرت ابو بکر نے وہی بات فرمائی تھی، جو دیگر احادیث مرفوعہ میں بطور خبر کے ثابت ہو چکی ہے۔ علی الخصوص بخاری کی روایت معاویہ میں۔

دعوائے اجماع

اب صرف ایک بات رہ گئی۔ یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیت پر زور دینا اور قاضی عیاض وغیرہ کا دعوئے اجماع، تو اس بارے میں چند امور قابلِ غور ونظر ہیں۔

اوّلاً اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق

وقت منعقد ہوا۔ جب حضرت عثمان کی شہادت کا ہنگامہ ہوا تھا یا اس وقت جب جمل وصفین کے میدان کارزار گرم ہوتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ واقعات کے تسلسل وتواتر سے خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ لوگوں کو اجماع کا خیال پیدا ہو گیا۔ یعنی چونکہ ابتدا سے خلافت پر قریش ہی کا قبضہ ہوا اور یکے بعد دیگرے تمام سلاسل حکومت قریشی ہی ہوتے، اس لیے لوگوں نے سمجھ لیا کہ شرعی فیصلہ بھی یہی ہے اور اس پر اجماع ہو گیا ہے۔ ورنہ اجماع صحابہ کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اور نہ عرصہ تک کسی خاص خاندان میں حکومت کا رہ جانا دلیل تشریع والعقاد واجماع ہو سکتا ہے۔ خود خلفاء عباسیہ کے عہد میں متعدد غیر قریشی مدعی اٹھے اور بعضوں کا ساتھ ہزاروں مسلمانوں نے دیا۔ وہ نہ خوارج میں سے تھے نہ معتزلہ میں۔ مگر یقین کرتے تھے کہ غیر قریشی خلیفہ ہو سکتا ہے۔ حجاج کے زمانہ میں ابن الاشعث نے خروج کیا اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ حالانکہ قریشی نہ تھا۔ اندلس اور افریقہ میں عبدالمومن صاحب ابن تومرت نے خلافت کے دعوے کے ساتھ حکومت قائم کی اور اس کی نسل میں عرصہ تک قائم رہی۔ ابن تومرت کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ معتزلی تھا؟ وہ امام غزالی کا شاگرد اور پکا اشعری تھا۔ عقائد اشاعرہ میں اس کا ایک رسالہ موجود ہے مراکشی نے تاریخ مراکش میں تصریح کی ہے کہ بلاد مغرب میں اشعریت اسی کے ذریعہ پہنچی اور اسی لیے خاندان عبدالمومن کا سرکاری مذہب ہمیشہ اشعری رہا۔ لیکن یہ لوگ بھی قریشی نہ تھے۔ علاوہ بریں خود ائمہ اشاعرہ میں سے

الخليفة قريشياً ، او تغير اجتهاد عمر فى ذلك والله اعلم

یعنی یہ جو قاضی عیاض نے کہا کہ خلافت کے مخصوص بہ قریش ہونے پر اجماع ہو چکا ہے، تو اجماع ماننے کی صورت میں حضرت عمرؓ کے قول کی تاویل کرنی پڑے گی جو امام احمد نے بسند صحیح معاذ بن جبل کے استخلاف کی نسبت روایت کیا ہے پھر کہتے ہیں کہ اس کی یوں تاویل کی جا سکتی ہے کہ شاید یہ اجماع حضرت عمرؓ کے بعد ہوا ہے، یا یوں کہا جاتے کہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد اس بارے میں بدل گیا۔

لیکن یہ تاویلیں جس قدر قابل التفات ہیں، اہلِ نظر سے مخفی نہیں - اول تو جب اختصاصِ قرشیت کے لیے کوئی نص شرعی موجود نہیں تو تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ثانیاً کہاں تو یہ دعوے کیا جاتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے وقت سقیفہ کے مجمع ہی میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہو گیا۔ اور تمام صحابہ نے اجماع کر لیا کہ خلافت کے حقدار صرف قریش ہی ہیں اور کہاں اب یہ تاویل کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا پورا زمانۂ خلافت گزر گیا اور اجماع نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کی زمانۂ خلافت کے دس برس گزر گئے اور صحابہ اس حکم سے بے خبر رہے۔ لیکن اس کے بعد یکایک اس پر اجماع ہو گیا؟ پھر اگر اجماع ہوا تو کب؟ اور کونسی دلیل اس بارے میں موجود ہے؟

اگر سقیفہ بنی ساعدہ میں اجماع نہیں ہوا۔ نہ خلافت صدیقی کے ڈھائی سال میں یہ مسئلہ چھڑا، اور نہ عہدِ فاروقی کے بہترین دس سالوں میں صاف ہوا جو فقہ و علوم کی تنظیم و تحقیق کا اصلی عہد تھا۔ تو پھر کیا یہ اجماع اُس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال کے تمام غیر معمولی اوصاف بیان کر دیئے تھے باایں ہمہ خود صحابہ کرام میں اختلاف ہوا، اور اپنے عہد کے مختلف اشخاص کو بعض اوصاف کے اشتراک کی وجہ سے دجّال سمجھتے رہے۔ آنحضرت کے زمانے ہی میں ابن صیاد کی نسبت حضرت عمرؓ کو خیال ہوا تھا حتیٰ کہ اس کو قتل کرنا چاہا۔ جیسا کہ امام بخاری کی روایت ابن عمر مندرجہ کتاب الجنائز میں موجود ہے اور ایک دوسری روایت مندرجہ کتاب الاعتصام بالسنۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو اس پر اس درجہ یقین تھا کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ یہی دجّال ہے اور اسی لیے ابن جابر کو بھی اس پر پورا یقین تھا۔ روایت جابر بن عبد اللہ یحلف باللہ ان ابن صیاد الدجال اسی طرح ابوداؤد کی روایت نافع میں حضرت عبداللہ بن عمر کی نسبت مروی ہے کہ قسم کھا کر کہتے تھے۔ واللہ ما اشک ان المسیح الدجال ھو ابن صیاد لیکن دیگر صحابہ کو اس سے اختلاف تھا۔ ابوسعید خدری سے جب ابن صیاد کی صحبت ہوئی تو ان کا شک دور ہو گیا۔ حتیٰ کہ معذرت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے (کما فی المسلم) اور مسلم میں قصہ تمیم داری موجود ہے جس کی بنا پر لوگوں کو ابن صیاد کے دجال ہونے سے انکار تھا۔

پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی۔ اس لیے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پوری پوری طرح ظاہر نہ ہو جائیں۔ ان کا ٹھیک ٹھیک مطلب متعین کیا جا سکے۔ خلافت کا یہ حال رہا کہ گو ابتدا سے بہت مدعی اٹھے مگر فی الجملہ نویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی اور اسی بات کی احادیث

بعض نے اس شرط سے انکار کیا ہے۔ جیساکہ امام ابو بکر باقلانی کی نسبت ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ جس اجماع کی نسبت دعوےٰ کیا جارہا ہے، اور جو کبھی حضرت ابو بکر کی بیعت سے پہلے مجلس سقیفہ میں رونما ہوتا ہے۔ کبھی وہاں سے روپوش ہو کر ساڑھے گیارہ برس تک مفقود ہو جاتا ہے اور حضرت عمر غیر قریشی کے استخلاف کا ارادہ کرنے لگتے ہیں۔ پھر ان کے بعد یکایک نمایاں ہونا چاہتا ہے لیکن پھر بھی اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ غیر قریشیوں کو ہزاروں مسلمان خلیفہ مان لیتے ہیں اور ائمہ عقائد و کلام مختلف فیہ نظر آتے ہیں۔ فی الحقیقت اس کا کوئی وجود ہے بھی نہیں۔؟

حقیقت یہ ہے کہ نہیں۔

ثانیاً یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا وہ محض آئندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی یعنی پیشین گوئی تھی اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک ان کا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے، ان کے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اجتہاد و قیاس کے لیے کسی چیز میں اتنی وسعت نہیں جس قدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے۔ علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیوں کا ایک خاص مبہم انداز بیان ہوتا ہے اور نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ محض اشارات کیے جاتے ہیں۔ جب تک ان کا ظہور نہ ہو جائے۔ اشارات کی تفصیل اور اوصاف کے انطباق میں طرح طرح کی لغزشیں پیش آجا سکتی ہیں۔

ظہور دجال کی پیشین گوئی اس معاملہ کے لیے ایک واضح مثال ہے۔

قریش کی خلافت قائم تھی۔ پس وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور جمے ہوئے ہیں اور اسی لیے "ما بقی منھم اثنان" کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے دو انسان بھی دنیا میں باقی رہیں گے، خلافت انھی میں رہے گی۔

لیکن اگر ان کو اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعوےٰ کر سکتے تھے؟ کیا اس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ وہ کیا جانتے تھے، کہ عنقریب صفحہ الٹنے والا ہے۔ اور خلافت نہ صرف قریش سے، بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے۔

اس سے بھی زیادہ بہتر مثال حافظ سیوطی کی ہے۔ حافظ موصوف عباسیہ مصر کے آخری عہد میں تاریخ الخلفاء اور حسن المحاضرہ لکھ رہے تھے۔ یعنی ہزارویں صدی کے اوائل میں۔ چونکہ اس وقت تک مصر میں عباسی خاندان منصب خلافت پر ممتاز تھا، اور گو عالم اسلامی بہت سی نئی عجمی حکومتوں میں بٹ چکا تھا تاہم لقب خلافت بجز عباسیۂ مصر کے اور کسی کے قبضہ میں نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے تاریخ الخلفاء کے ابتدا میں ایک باب باندھا ہے "احادیث المبشرۃ بخلافت بنی عباس" اس میں وہ تمام روایتیں جمع کی ہیں جن میں عباسیہ کو خلافت پانے کی بشارت دی ہے، اور کہا کہ تمہاری خلافت حضرت عیسیٰؑ کے نزول تک رہے گی۔ چنانچہ ابو نعیم کی روایت میں ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباس پیدا ہوئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا ھو ابو الخلفاء حتی یلد

میں خبر بھی دی گئی تھی، جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے وہ سب وہی ہیں جن کا ظہور ساتویں صدی او راس سے پیشتر یعنی عہد خلافت قریش میں ہوا پس ضرور تھا کہ معاملہ خلافت کو ابتداء سے قریش ہی میں محدود دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر جاتے کہ مقصود تشریع وحکم نہ تھا محض خبر دی گئی تھی۔ وہ ان حدیثوں کا مطلب صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے مجبور و معذور تھے۔

حافظ نوادی شرح مسلم میں لکھتے ہیں وقد ظهر ما قاله صلعم فمن زمنه الى الأن الخلافة فى قريش من غير مزاحمة لهم فيها و بتقى كذالك ما بقى منهم - اثنان (جلد۲: ۱۲۹) یعنی جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا۔ آنحضرت صلعم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکاوٹ کے قریش ہی میں رہی اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہے گی جب تک دو قریشی بھی دنیا میں باقی رہیں گے۔

حافظ نوادی کا سال وفات ۶۷۶ھ ہے اور سال پیدائش ۶۳۱ھ یا اس سے بھی پہلے۔ آخری خلیفہ بغداد المعتصم کو ہلاکو نے ۶۵۶ھ میں قتل کیا۔ پس گو ان کی وفات فتنۂ تاتار کے بعد ہوئی لیکن تصنیف و تالیف کو زمانہ مستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے۔ اگر شرح مسلم وغیرہ بالکل آخری عمر کی تصنیف ثابت ہو جائے تو پھر خلفائے عباسیہ مصر کا زمانہ ہو گا کہ فی الجملہ

کے سپرد کر دیں۔

لیکن اگر حافظ سیوطی پچیس برس اور زندہ رہتے اور دیکھ لیتے کہ خلافت و حکومت کا نام و نشان تک عباسیہ میں باقی نہ رہا تو پھر ان کو پورا پورا یقین ہو جاتا کہ عباسیہ کو آخر عہد تک خلافت و پادشاہت کی کوئی بشارت نہیں دی گئی اور یقیناً یہ تمام حدیثیں وضعی ہیں جیسا کہ ائمہ اثر فیصلہ کر چکے ہیں۔

چنانچہ یہ بات صاف صاف تتبع و نظر سے واضح ہو جاتی ہے کہ خلافتِ عباسیہ بغداد کے تنزل اور عجمی حکومت کے ظہور و عروج کے ساتھ ہی علماء کی آراء میں بھی تدریجی تغیر شروع ہو گیا تھا اور اشتراطِ قرشیت میں وہ زور باقی نہ رہا تھا، جو قاضی عیاض وغیرہ کی مصنفات میں پایا جاتا ہے۔ اکثر علماء نے جب دیکھا کہ "ما اقاموا الدین" کی شرط کا ظہور ہو گیا ہے اور حکومت قریش کے قبضہ سے نکل گئی ہے۔ نہ تو ان کی رائے بدل گئی، اور قاضی عیاض والے اجماع کے دعوے میں تامل کرنے لگے۔ علامہ ابن خلدون (المتولد ۷۳۲ھ) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لما ضعف امر قریش، وتلاشت عصبیتهم بما نالهم من الترف والنعم وبما انفقتهم الدولة فی سائر اقطار الارض عجزوا عن حمل الخلافة وتغلبت علیهم الاعاجم وصار الحل والعقد لهم فاشتبه ذلک علی کثیر من المحققین، حتیٰ ذهبوا الی نفی اشتراط القرشیة وعولوا علی ظواهر فی ذلک مثل قوله صلعم:

منهم السفاح حتیٰ یکون منهم المهدی، حتی یکون منهم من یصلی بعیسیٰ بن مریمؑ یعنی آپ نے فرمایا عبداللہ بن عباس خلفاء کا باپ ہے یہاں تک کہ انہی خلفاء میں سے سفاح ہوگا، اور انہی میں سے مہدی ہوگا اور انہی میں وہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ نماز پڑھے گا۔

اگرچہ یہ تمام روایتیں قطعاً جھوٹی ہیں۔ ابومسلم خراسانی وغیرہ عباسی داعیوں کی بنائی ہوئی ہیں اور تمام ائمہ حدیث ونظر نے ان کے خرافات وموضوع ہونے پر اتفاق کیا لیکن چونکہ اس وقت تک عباسیوں میں خلافت کا انتساب باقی تھا اور واقعات کی بنا پر اس پیشین گوئی کی تکذیب نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز عباسی خلافت کا حاکمانہ اثر ان روایات کی مقبولیت کا باعث ہو رہا تھا۔ اس لیے حافظ سیوطی ان کے لیے ایک خاص باب قائم کرتے ہیں اور اگر کسی روایت کو سنبھالنے کا ذرا سا بھی موقع مل جاتا تو نہیں چوکتے۔ چنانچہ ابونعیم اور دیلمی کی روایات سے کچھ تعرض نہیں کیا ہے، حالانکہ حافظ مزی، ابن ذہبی، العبید ابن کثیر وغیرہم نے سخت انکار کیا ہے، اور ابن جوزیؒ کتاب الموضوعات میں لائے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیباچہ میں بنو عبید کی خلافت پر بحث کرتے ہوئے ان احادیث سے یقین کے لہجہ میں استدلال کرتے ہیں ان الحدیث ورد بان ھذا الامر اذا وصل الی بنی العباس لا یخرج عنھم حتی یسلمون الی عیسیٰ بن مریم او المھدی (تاریخ الخلفاء ۸۰) یعنی یہ بات حدیث میں آچکی ہے کہ جب خلافت آلِ عباس تک پہنچے گی تو پھر انہی کے قبضہ میں رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ حضرت عیسیٰ یا امام مہدی

خصص مفهوم الحصر احادیث وجوب الطاعۃ لغیر القرشی الی ان قال والاخبار منہ صلعم بان الائمۃ من قریش ھو کالاخبار منہ بان الاذان فی الحبشۃ والقضاء فی الازد، وما ھو الجواب عن ھذا فھو الجواب عن ذلک و تخصیص کون الائمۃ من قریش ببعض بطونھم لایتم الا بدلیل والاخذ بما دفع علیہ الاجماع لاشک انہ احوط واما انہ یتحتم المصیر الیہ فلیس بواضح، ولو صح ذلک، لزم بطلان اکثر ما دونوہ من المسائل والمقام والمراکز و ما احقہ بان لا یکون کذالک یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایات میں ایسے الفاظ ہیں جن سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وجوب طاعت امام کے عام احکام کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ وہ دلالت کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی اطاعت امت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت نے قریش میں امامت کی خبر دی، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا امام ہوا ہی نہیں۔ یہ ویسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبر دی کہ اذان کا کام اہل حبش میں ہے اور قضا ازدیوں میں جس طرح ان روایتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ موذن اور قاضی صرف حبشی اور ازدی ہی ہونے چاہئیں، اسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے، جو جواب ان کا دیا جائے گا وہی اس کا ہو گا۔

یہ واضح رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع

اسمعوا و اطیعوا وان امر علیکم عبد حبشی ما اقام فیکم کتاب اللہ "
یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہوگئی۔ عیش پرستیوں میں پڑکر اپنی عصبیت مٹادی۔ خلافت کا بوجھ اٹھانے سے عاجز ہوگئے تو عجمیوں نے اُن پر غلبہ حاصل کرلیا اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قرشیت کی شرط مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کردیا۔ انتہا۔

اشاعرہ کے امام الائمہ قاضی ابوبکر باقلانی نے بھی یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قرشیت کی شرط ضروری نہیں۔ یہی ابن خلدون لکھتے ہیں ومن القائلین بنفی اشتراط القرشیۃ القاضی ابوبکر الباقلانی "

عباسیہ بغداد کے انقراض کے بعد مصر میں عباسی خلافت کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس لیے اس عہد کے علماء مصر نے (مثلاً حافظ ابن حجر، قاضی عینی، جلال الدین سیوطی وغیرہم) قرشی جماعت کو فی الجملہ قائم پایا۔ لیکن جب یہ نقش بھی مٹ گیا، اور وہ زمانہ آیا جس کی خبر دے دی گئی تھی کہ بعث اللہ علیکم من یلحاکم کما یلحی القضیب" تو جو اہل نظر اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ اشتراط قرشیت کا کوئی ثبوت نہیں، اور نہ خلافت قریش کا وہ مطلب ہے جو اب تک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے مشہور مجدد فقہ د حدیث امام شوکانی یمنی وبل الغمام میں شرط قرشیت کے دلائل نقل کرکے لکھتے ہیں :-

لا ریب ان فی بعض ھذہ الالفاظ ما یدل علی الحصر ولکن قد

مذهب الشافعی والجماهیر، وخالف فیه ابوحنیفة" یعنی امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ نے اس سے خلاف کیا اگر ہمارے علمار احناف حافظ نوادی کی ان تمام جمہوریات واجماعیات کو تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہیں، تو خیر، اشتراطِ قرشیت کا ایک اجماع اور سہی لیکن یاد رہے کہ یہ وہی بات ہو گی کہ :

گوشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

ثانیاً ہمارا خیال ہے کہ یہ بات بھی اور بے شمار باتوں کی طرح وقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی، یہ ظاہر ہے کہ معاملۂ خلافت ابتدار سے سخت کش مکش و تزاحم رہا۔ جو خاندان قابض ہوا اس کو رقیبوں اور دعوے داروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہا۔ پس جبکہ خلافت اہلِ عرب کے ہاتھ میں تھی تو وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ عجمیوں کے ولولوں کی اس بارے میں جرأت افزائی کی جاتے اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی۔ جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا، تو وہ کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کرکے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جاتے! بخاری کی روایت میں پڑھ چکے ہو کہ امیر معاویہ نے قحطانی پادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس درجہ مضطرب اور غضبناک ہوتے؟ اور کس طرح فوراً قریش والی روایت کا اعلان کر دیا تاکہ پہلے ہی سے سدِ باب ہو جاتے! جن علمار کے اقوال پر متاخرین فقہار و متکلمین کا اعتماد ہے، وہ سب کے سب وُہی ہیں جن کا ظہور آخر عہدِ عباسیہ میں ہوا ہے

ثابت کیا جاتا ہے۔ وہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی
قائم تھی۔ بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے انہی سے لیا ہے سب سے زیادہ
اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے۔ جن کا قول نواوی
نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے۔ ان کا سالِ وفات ۵۴۴ھ
ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو وسعت
اختیار کرلی ہے اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی واصولی معنی
سے ہٹ کر مختلف مصطلحہ معنوں میں ہونے لگا ہے، اس کو فراموش نہیں کرنا
چاہیے۔ علی الخصوص فقہاء مذاہب کے استعمالات متکلمین اور ارباب اصول کے
مصطلحہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر مذہب کے فقہا بلا تامل اپنے مسلک
کو "جمہور" اور "اجماع" کے لفظ سے تعبیر کردیتے ہیں۔ اس میں کسی کا مطلب کچھ
ہوتا ہے کسی کا کچھ۔ صاحبِ ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم وجوب قرأت
فاتحہ خلف الامام اور افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے۔ بعضوں نے اجماع تک
کہہ دیا۔ لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قرأت فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے
اور اسی پر جماہیر علماء کا اتفاق ہے۔ انہی حافظ نواوی کی (جو اشتراطِ قرشیت
کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں) شرح مسلم دیکھ لی جائے کس طرح
شافعیہ کا ہر مذہب ان کے نزدیک جمہور کا مذہب ہے، اور مخالف کا
ہر قول شاذ۔ شافعیہ اور حنفیہ کی خلافیات میں تقریباً دو تہائی مسائل
توضرور ایسے ہوں گے جن کی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے "ھذا

بحث و نظر کے اضطراب و ضعف نے خود بخود مسئلہ کا مخالف پہلو قوی کر دیا ہے اور بہ یک نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی مضبوط رائے نہیں رکھتے اور اگر مائل ہیں تو انکار کی طرف۔ اشتراط قرشیت کے مریدین کے جس قدر دلائل ہیں، اُن میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں جس پر انہوں نے سنگین اعتراضات نہ کیے ہوں اور وہ مجروح ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ جو صاحب مزید بصیرت حاصل کرنی چاہیں، فتح الباری جلد ۳ کتاب الاحکام کے ابواب "الامراء من قریش" اور "السمع والطاعۃ للامام" ملاحظہ فرمائیں۔

غرضیکہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر ڈالی جاتی ہے اشتراط قرشیت کے لیے کوئی نص موجود نہیں۔ اگرچہ بصورت اشتراط بھی موجودہ مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں ہے امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے۔

خلافت آلِ عثمان

چند لمحاتِ تاریخیہ

اب بہتر ہو گا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم آگے بڑھنے سے رُک جائیں اور

جب قرشی خلافت قائم تھی۔ مثلاً قاضی عیاض و امام نواوی وغیرہم۔ پس وقت کی حکومت کا جو پولیٹیکل اثر سب پر پڑ رہا تھا، وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد رائے کو دخل ہو۔ فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر اسی جانب ہو جاتے علی الخصوص جبکہ اس کے لیے کسی غلط بیانی یا تحریف احکام کی ضرورت نہ تھی۔ واقعی احادیث موجود تھیں۔ صرف مفہوم کی تعیین میں اجتہاد کا کام کرنا تھا۔ اس مسئلہ پر موقوف نہیں، وقت کے پولیٹکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں، اور آج ان کا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا، تو آہستہ آہستہ اس اثر سے افکار خالی ہونے لگے اور تبدریج بحث و نظر کی صورت دوسری ہو گئی، حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی یا نویں کے اوائل میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں، ان کے مباحث پڑھو تو قاضی عیاض اور نواوی سے ان کا رنگ مختلف نظر آئے گا۔

قاضی عینی بخاری کی حدیث معاویہ "ما اقاموا الدین" کی شرح میں لکھتے ہیں: ای مدت اقامتھم امور الدین قیل یتحمل ان یکون مفہومہ فاذا لم یقیموہ لا یسمع لھم یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ "جب تک دین قائم رکھیں گے" تو اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ وقت آ جائے کہ قریش اقامت دین نہ کریں تو ان کی بات نہ سنی جائے گی۔ حافظ عسقلانی گو اشتراط قرشیت سے صاف صاف انکار نہیں کرتے لیکن طرز

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

یہ سب ہو چکا، مگر ابھی پیشین گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی، یعنی "بقی منہم اثنان" قریش سے حکومت نکل جائے گی پر نکل جانے پر ان کی عظمتِ رفتہ کا یہ اثر باقی رہے گا کہ اگر دو قریشی بھی کسی گوشہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) ثم بعثنا علیکم عبادا لنا اولی باس شدید فجاسوا خلل الدیار وکان وعدا مفعولا (۱۷: ۶) بحکم یاتی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل (صحیحین) اس امت پر بھی وہ سب کچھ گذرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گذر چکا۔ بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے دور آئے اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی بھی چھائی اور ان کی تہذیب کے لیے دو جابر و قاہر قومیں مسلط ہوئیں: وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا" (۱۷ : ۵) پہلی بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ عبادا اولی باس شدید اور دوسری ٹیٹس قیصر روم کے ہاتھوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت پر بھی طغیان و عصیان کے دو بڑے وقت آنے والے تھے اور ان کے نتائج دو معذب قوموں کی شکل میں ظاہر ہوتے قوم تاتار اور اقوام یورپ، بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیا ہی کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی یعنی اہل بابل کے ہاتھوں۔ اور دوسری کا ظہور یورپ سے ہوا۔ یعنی روم سے۔ ٹھیک اسی طرح اس امت کے لیے بھی فتنہ ایشیا کا تھا۔ دوسرا یورپ کا۔ پہلا ہو چکا۔ دوسرا ہو رہا ہے۔

گذشتہ تیرہ صدیوں کی طرف مڑ کے دیکھیں کہ خلافت اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے؟

"الخلافة بعدی ثلاثون سنة" میرے بعد خلافت خاصّہ ۳۰ برس تک رہے گی، کی خبر کے مطابق خلفائے راشدین کا دور ۳۰ برس تک رہا ۱۱ھ سے شروع ہوا اور ٹھیک ۴۱ھ تک باقی رہا۔ اسی سنہ سے بنوامیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد خلافت نے ایک نیا ورق اُلٹا، اور خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی ہے جو ۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ تک قائم رہا۔ چونکہ کامل پانچ صدیوں تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی اس لیے وہ تمام ذہنی وجسمانی، و مدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے جو ہمیشہ امتداد، سلطنت اور عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں قریش کی نسبت فرمایا تھا: "ما اقاموا الدین" جب تک وہ دین قائم رکھیں گے حکومت انہی میں رہے گی۔ سواب ٹھیک ٹھیک وہ وقت آگیا تھا، قریش وعرب میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ قیام دین کا کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں۔ پس وہی ہوا جو تاریخ عالم کے ہر ایسے دور میں ہوتا آیا ہے۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خان تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم باللہ کے خون نے بہہ کر ہمیشہ کیلئے عربی وقریشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ مستعصم کا قتل فی الحقیقت عربی خلافت کا قتل تھا[1]

---

[1] تاتار کا ظہور مسلمانوں کے لیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل کے لیے بخت نصر کے ظہور میں۔

شہزادہ ابوالعباس احمد بن علی بچ کر نکل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا۔ اس کا حال بیبرس کو معلوم ہوا تو بڑے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حاکم بامر اللہ کے لقب سے وہ مشہور ہوا اور اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ برس تک قائم رہی۔ یعنی سنہ ۶۵۹ھ سے سنہ ۹۲۳ھ ہجری تک۔

اس عرصہ میں عالم اسلامی دو صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے تہ و بالا ہو کر بالآخر ایک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ و ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ سنہ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ مسیحی) میں سلطان سلیم خان اول نے مصر و شام پر قبضہ کیا، اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت سپرد کر دیئے حقوق خلافت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ و حرمین کی کنجیاں تھیں اور بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت صلعم کی تلوار جھنڈا، ایک چادر، یہ آثار اس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں۔ اسی تاریخ سے عثمانی سلاطین نمایاں طور پر "خلیفہ" کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے، اور حجاز اور مصر و شام کے منبروں پر ان کا ذکر بہ حیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا حج کی امارت بھی انہی کے قبضہ میں آ گئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

میں نکل آئیں گے تو لوگ خلافت کا اُنہی کو مستحق مانیں گے۔ بغداد میں قریشی خلافت مٹی، لیکن مٹتے مٹتے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی۔ وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اُکھڑا اور تین سو برس تک کے لیے مصر میں جا کر جم گیا۔ البتہ یہ جماؤ قریشی حکومت کا جماؤ نہ تھا۔ محض اُس کے نقشِ قدم کا تھا۔

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط
لیکن اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

عباسی خاندان کے دو چار آدمی بغداد کے قتلِ عام سے بچ کر نکل گئے تھے۔ ان ہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا۔ وہ ۶۶۰ھ میں مصر پہنچا۔ وہاں ایوبی خاندان کے ممالیک کی حکومت قائم تھی، اور ملک ظاہر بیبرس حکمران تھا۔ اس کو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار تسلیم کر لیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

احمد بن ظاہر نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور بیبرس کی معیت و اعانت حاصل کر کے کوشش کی کہ دار الخلافت بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلائے لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا۔

اب پھر وہ وقت آ گیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انتساب بالکل معدوم ہو جائے لیکن "ما بقی منھم اثنان" کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھلانے والی تھی۔ قتلِ عام بغداد سے ایک اور عباسی

خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں۔ سلطان سلیم خان اوّل کے عہد سے لے کر آج تک بلانزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ و امام ہیں۔ ان چار صدیوں کے اندر ایک مدّعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں اٹھا۔ بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں بے شمار رقیبوں اور دعویداروں کی کشمکش نظر آتی ہے لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدّعی خلافت کا نام بھی ڈھونڈ کر نہیں نکالا جا سکتا۔ حکومت کے دعویدار سینکڑوں اٹھے ہوں۔ مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی نہ کر سکا۔

صدیوں سے اسلام و بلادِ اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے صرف انہی کی لاشیں اسلام کے لیے خاک و خون میں تڑپتی ہیں۔ اور صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار چھوڑ رکھا ہے۔ دنیا کے خواہ کسی گوشہ میں کوئی مسلمان ہو اگر وہ بحیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کے لیے نکلتا ہے تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہو کر اس کو عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بھیجے ہوتے

سلسلۂ خلافت کی یہ ایک مجمل تاریخ ہے۔ بالفرض خلیفہ متوکل عباسی
نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ہوتی، جب بھی آئندہ پیش آنے والے
واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام عالم اسلامی کی خلافت کا منصب عثمانی
سلاطین ہی کے قبضہ میں آجاتے۔ وقت کی جو اسلامی سلطنت
سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت
رکھتی ہو، وہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے گزشتہ چار صدیوں
کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے
کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا
خود ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت قائم تھی۔ وہ ہندوستان کے
اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے، لیکن عالم اسلامی کی خلافت عظمیٰ کا دعویٰ کبھی
ان کے وہم و خیال میں بھی نہیں گذرا۔ اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کے لیے تیار
نہ تھی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک مقام خلافت کی جو اہم و مشترک خصوصیات
رہی ہیں اور جن کو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً بطور اسناد خلافت کے تسلیم
کر لیا ہے، وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئی
کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار و اختیارات کے ساتھ
قائم نہ ہو سکی۔

بدوستیٔ تو خصمند عالمے با من!
ہزار دشمن و یک دوست مشکل افتاد است

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق وُہی آج تمام مسلمانانِ عالم خلیفہ و امام اور "اُولوالامر" ہیں ان کی اطاعت و حمایت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ ان سے پھرنا اور ان کو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا اللہ اور اس کے رسول سے پھرنا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو اپنی جان و مال کی طرف سے صاف جواب دے دینا ہے جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا۔ اگرچہ بالشت بھر باہر ہوا ہو، اور اسی حالت میں مرگیا۔ اس کی موت اسلامی زندگی کی موت نہ ہو گی۔ جاہلیت کی موت ہو گی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ جس نے اُن کے مقابلہ میں تلوار اُٹھائی وہ مسلمانوں میں سے نہیں، اگرچہ دنیا اس کو مسلمانوں میں سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت، اُس کی شریعت کی ان گنت اور بے شمار دلیلیں، ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ اسلام کی سیکڑوں نسلوں اور لاتعداد گھرانوں کا تعامل و اجماع اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت، یہی بتلا رہی ہے اور ہر مسلمان کے دل پر نقش ہے۔ ایک مسلمان کے لیے بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو، اور دنیا سے ایک مومن اعتقاد و عمل ساتھ لے جانا چاہتا ہو اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں جاہل سے لے کر عالم تک مزدور سے لے کر نظام دکن تک کوئی نہیں

نائب کے ماتحت انجام دیتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم محاربین کا ساتھ دے کر اگر بغاوت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کر لیا تو یہ فساد و عدوان کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں، حجاز حکماً اب بھی خلیفہ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جزء ہے اور تمام مسلمانانِ عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک بغاوت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو ہر مسلمان اُس کے لیے عنداللہ جواب دِہ ہو گا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام و عیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے بستر پر سونے کے لیے ہیں۔ لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت و زندگی کے بچاؤ کے لیے صدیوں سے تلوار کے سائے تلے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ کامل پانچ صدیوں سے یورپ اور ایشیا کا سب سے بڑا رقبہ ان کے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک ایسی نہیں گزری کہ دشمنوں کی تلواروں نے اُنہیں مہلت دی ہو۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کوئی نہ رہا۔ ساری تلواریں ٹوٹ گئیں، سارے بازو شل ہو گئے تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کے لیے باقی ہیں؟ اور کیوں وہ وقت آنے نہیں دیتے جب اسلام کی پولیٹیکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔

لیکن وہ ان ترکوں کے لیے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع ہُوئے، نہ ایران و عراق پر۔ نہ شام و فلسطین کی حکومت ان کو خوش کر سکی نہ وسطِ ایشیا کی بلکہ تمام مشرق سے بے پرواہ ہو کر یورپ کی طرف بڑھے اس کے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کر لیا اور اس کی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دارالحکومت اسٹریا کی دیواریں ان کے جولانِ قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں!

ترکوں کا یہ وُہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا اس لیے ہر حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے اس لیے کہ یورپ کا طلسم سطوت اس کی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔

ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے ساتھ حکومت کی ہے، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ویسی ہی زندہ و توانا رہی جیسی کہ متعصب سے متعصب مسیحی حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد خود مختار ہو گئے اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ رہے ہیں۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلّط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے ہیں جن کے آباء و اجداد

جس کا دل اس اعتقاد سے خالی ہو۔ زندگی کا عشق اور نفس کی پرستش جس
انسان سے چوری کرا لیتی ہے۔ ڈاکے ڈلواتی ہے، قتل کراتی ہے اُس انسان
سے کیا بعید ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے
یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے؟
دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی درد انگیز مثالوں سے لبریز ہے۔
پس یہ کوئی عجیب واقعہ نہ ہوگا۔ اگر آج چند نئی مثالوں کا مزید اضافہ
ہو جائے۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اس سے انکار کیا جا سکتا
ہے لیکن اس کو چھپایا نہیں جا سکتا اس سے اغماض کیا جا سکتا ہے لیکن اس
کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے آنکھیں بند کر لی جا سکتی ہیں اُس کی زبان
بند نہیں کی جا سکتی۔

ہم یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی کارگزاریوں کی بحث نہیں
چھیڑیں گے۔ ہم کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمران جماعتوں میں ترکوں ہی
کی جماعت وُہ بدقسمت جماعت ہے جس کے لیے کوئی یوروپین دماغ منصف
نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا پچھلا مؤرخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا مدبر، وہ گذشتہ عہد
کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جو اب موجود
نہیں ہیں۔ لیکن ان ترکوں کی نہیں کر سکتا جن کی تلواریں پانچ صدیوں سے
یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کے لیے چمکتی رہی ہیں وُہ خلافتِ
بنو امیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے۔ عباسیہ کے دور علم و تمدن کی مدح
سرائی کر سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بُت کی طرح پوج سکتا ہے

کی حمایت ہی کے لیے آسمان سے اتارے گئے ہیں:

یہ کرۂ ارضی کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے۔ آج اس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی۔ اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا، اور مؤرخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جا سکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔ سنت اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

بہر حال ہماری صحبت سے یہ موضوع باہر ہے۔ ترکوں کی حکمرانی جیسی کچھ بھی رہی ہو۔ ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے اشرار بنو امیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو[1] لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان

---

[1] آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حریف حکومتوں کے اُن مغرور وزراء کے ہاتھوں میں ہے جو میدانِ جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرتے بیٹھے ہیں۔ پس امید نہیں کہ ڈریپر (DRAPER) جیسے زمانہ حال کے مؤرخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے۔ یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب KELIGION BETWEEN ANDSCIENCE میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی

ساٹھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمران تھے۔ صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرزِ حکومت اور ترکوں کے طرزِ حکومت کا فرق واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ وحشت ناک بلائیں نہیں آسکتیں، جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور بُت عین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں ایشیاء و افریقہ کے اندر کر چکا ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے درندے آرام کی نیند سوئے اور سانپوں کو ان کی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا، لیکن ایشیاء و افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ بچ سکا جس کو وہاں کی بدبخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے، اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کر سکے۔

خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح پھاڑا، اور ہر سفید بھیڑیئے نے دوسرے سفید بھیڑیئے پر جس طرح پنجہ مارا نہ صرف ترکوں میں بلکہ تمام ایشیاء کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

بایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں، اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے۔ علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بستے ہیں، وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں

نمی دانم ز منع گریہ مطلب چیست ناصح را؟
دل از من، دیدہ از من، آستیں از من، کنار از من

مُسلمانانِ ہند اور خلافتِ سلاطینِ عُثمانیہ

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی ہندوستان سے تمام حکمران خاندان اسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے۔ عبّاسیہ بغداد کی خلافت جب مٹ گئی اور ۶۶۰ھ میں مصر کی عبّاسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا تو اگرچہ یہ عبّاسیہ کے کاروان رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا۔ تاہم تمام سلاطین ہند اس کی حلقہ بگوشی وغلامی کو اپنے لیے موجب فخر و امتیاز سمجھتے رہے، اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوا دینے کے لیے مقام خلافت سے پروانہ نیابت حاصل کرتے رہے۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ کے غرور حکومت کا یہ حال تھا کہ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی اس کو "ہمت فرعونی و نمرودی" سے تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ غرور جو وہ کرسکا یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفۂ مصر کا سب سے بڑا فرمانبردار غلام اور چاکر ظاہر کرے۔ اور رعایا کو یقین دلاتے کہ بلا اس کے حکم میں تم پر حکومت نہیں کرتا۔ تاریخ برنی میں ہے۔

حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے۔ اور ان کا از رُوئے شرع یہی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفۃ اسلام ہیں۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطائن پر حاصل تھی۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرھویں اور سولھویں صدی کے تمام یوروپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے وہ کہتا ہے انسائیکلو پیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے کا ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا۔ یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلو پیڈیا ڈاں بمبرٹ (DALADIBERT) نے لکھی۔ لیکن اس کو ایک ترک مصنف کلبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی کمسریٹ، رسد رسانی اور فوجی شفاخانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے۔ فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا۔ چیچک کے ٹیکے کا اصلی موجد ایک ترک تھا۔ ڈریپر، کریسی، کننگھم، کلفرڈ وغیرہ مؤرخوں کی تحقیق ہے۔ جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی۔ قدرتی طور پر سٹر ابسکو یتھ اور مسٹر لائیڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں اور کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں؛

شمس الدین سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب خلیفہ کے سفراء شہر کے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کے لیے پیدل نکلا۔ فرمانِ خلافت کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا پھر بوسہ دے کر سر پر رکھا، اور اسی طرح سر پہ دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا۔

غور کرو! مقامِ خلافت کی عظمت و جبروت کا اثر کس درجہ عالمگیر رہا ہے؟ خلافتِ بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف برائے نام نسبت اس درجہ ہیبت و جبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے بعید گوشہ میں ایک عظیم الشان فرمانروائے اقلیم، اذن و اجازت ہو جانے پر فخر کرتا ہے اور مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالمِ اسلامی پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرمان آسمانی فرمان اور وہاں کا حکم بارگاہِ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے۔

مغلیہ سلطنت خلفائے مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی، ہندوستان میں بابر شاہ کی قسمت آزمائیوں کا زمانہ تھا جب سلطان سلیم خان کے ہاتھ پر خلیفۂ متوکل عباسی نے بیعت کی اور حجاز و شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا شاہانِ مغلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے اور باعتبارِ حکومت کے یہ حق انہیں حاصل بھی تھا۔ تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دعویٰ نہ کیا۔ ہمیشہ عرب و شام کے مسلمہ خلفا ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ شہنشاہِ اکبر اور شاہ جہان بھی اگر حج کے لیے جاتے تو ان کو قسطنطنیہ

"امیرالمؤمنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود، و بے امر و بے فرمان او دست در امور او لوالامری نہ زد" (مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی صفحہ ۴۶)

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل و سوانح کے لیے گیارہ مقدمے ترتیب دیئے ہیں، ان میں نواں مقدمہ یہ ہے۔

"مقدمہ نہم در آنکہ دو کرت از حضرت امیرالمومنین خلعت اولوالامری و منشور اذن، و لواء شاہی بر سلطان عصر فیروز شاہ رسیدہ، و بادشاہی و الوالامری خداوندان عالم بداں استحکام گرفتہ"

پھر اسی مقدمہ میں لکھتا ہے:

"در مدت شش سال دو کرت از امیرالمومنین منشور اولوالامری و خلعت شاہی و لوار سلطنت بدو رسید، دحق جل و علیٰ پادشاہ دین پرور مارا در عزت داشت منشور و خلعت فرستادگان توفیق بخشید و شرائط حرمت مراحم امیرالمومنین بالغا بلغ بجا آورد، وہم چنیں دانست کہ منشور و خلعت امیرالمومنین از آسمان منزل شدہ، و از درگاہ مصطفیٰ صلعم رسیدہ عرائضدا شتے با تحفہ و ہدایا در نہایت تواضع بندگی امیرالمومنین رواں کرد الخ (صفحہ ۵۹۸)

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل و مفاخر میں سے ایک بڑی بات یہ سمجھی گئی کہ خلیفۂ مصر نے اجازت حکومت کا پروانہ اور لواء و خلعت بھیجا اور پادشاہ کو اس کی اطاعت و حرمت کی توفیق ملی۔ فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی۔ گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی اور خود بارگاہ حضرت محمد الرسول اللہ صلعم سے اس کو قبولیت کی سند مل گئی۔

اسلامی حکومتیں موجود تھیں، وہاں کے مسلمانوں کی اطاعت و انقیاد کا محل و مرکز خود اسلامی مقامی حکومت ہو گئی تھی، اور احکام شرعیہ کے نفاذ و اجرار کے لیے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے محتاج نہ تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا تعلق کسی نمایاں شکل میں یکایک ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطنت کے رقیبانہ جذبات بھی اپنی انتہائی حالت میں سب پر چھائے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے سے تفرقہ و انتشار کی عالمگیر مصیبت تمام عالم اسلامی کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکی تھی۔ لیکن ان ممالک کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے، وہ اگرچہ ترکی حکومت سے کتنے ہی دور دراز گوشوں میں واقع ہوں، لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمیٰ پر فتا بضی و متصرف تسلیم کرتے تھے، اور اسی لیے جمعہ و عیدین کے خطبوں میں ان کے لیے خاص طور پر دعا مانگنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفۂ قسطنطنیہ کی حیثیت دینی کا پورا پورا اعتقاد رکھتا تھا۔

جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں ۱۱۷۵ھ – ۱۷۶۱ء میں دکن کے مشہور عالم سید قمر الدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کے معاصر ہیں۔ اپنی کتاب سبحۃ المرجان میں ان کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں ڈچوں کی حکومت ہے۔ اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے کولمبو میں

کے خلیفہ ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا۔ میدانِ عرفات میں وہ خود خطیب نہ ہوتے۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا۔ وہ کھڑے ہو کر اسی طرح سنتے جس طرح ایک عام مسلمان ان کے بغل میں کھڑا سُن رہا ہوتا۔ شرعاً وعقلاً تسلیم خلافت کے لیے اس سے زیادہ اور کون سی بات ہو سکتی ہے؟

بعض یورپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر سلطان عبدالحمید خان مرحوم کی سعی سے پیدا ہوا اور ان کا مقصود اس سے یہ تھا کہ نام نہاد "پان اسلامزم" تحریک کو تمام مسلمانانِ عالم میں پھیلایا جائے۔ یہاں ہم یورپ کے متخیلہ و متوہمہ "پان اسلامزم" کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ "پان اسلامزم" سے اگر مقصود مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن و قومیت باہمی برادری ہے، تو اس کی تاریخ سلطان عبدالحمید کے زمانے سے نہیں، بلکہ نزول قرآن و ظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد کو سلطان عبدالحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد درجہ جہل کا نتیجہ ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا اور ہم نہیں جانتے کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کے لیے پسند کریں؟ ۹۲۳ھ میں جب بعہد سلطان سلیم خان سلاطین عثمانیہ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیے گئے، تو اس وقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین صفویہ کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ کی، اندرون یمن میں ائمہ زیدیہ کی اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ کی پس جہاں جہاں

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیداوار ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ بہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی، کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ البتہ سلطنت مغلیہ کے انقراض کے بعد وہ مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتۂ انقیاد و عقیدت قائم کرلیں۔ تاہم اسلام کی مرکزی خلافت پر سلاطین عثمانیہ کا قابض ہونا ایک ایسی مسلّم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات ۱۱۷۶ھ ہے۔ ان کا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا۔ اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انھوں نے تفہیمات الٰہیہ میں دو جگہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"از زمان سلطان سلیم خان کہ در اوائل سنہ الف بود، اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین روم اند، و خدمت الحرمین الشریفین زادہما اللہ شرفاً و کرامتہ، و امارت موسم و ریاست حجاج، و اہتمام محامل و قوافل بہ ایشاں استقرار یافتہ، بہمیں جہت بر منابر عرب و شام خصوصاً حرمین الشریفین ہر یکے از ایشاں بہ لقب امیر المومنین مذکور است۔"

یمن میں اگرچہ ائمہ زیدیہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے، اور انھوں نے اندرون ملک میں کبھی ان کی حکومت جمنے نہ دی، بایں ہمہ گیارھویں سے تیرھویں صدی تک علماء یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ

مسلمانوں کے دو محلے ہیں۔ جمعہ کی نماز تین مرتبہ سید موصوف نے وہاں پڑھی خطبہ میں امام نے پادشاہ ہند اور سلطان روم کے لیے دعا مانگی تھی۔ "لکونہ خادما للحرمین الشریفین"۔ یعنی اس لیے کہ وہ خادم حرمین ہیں۔ (سبحۃ المرجان مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۳)

یہ اب سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے۔ تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہندوستان ان سے بالکل متصل تھا۔ لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کے دعا مانگنا جو بحر ہند سے اس قدر بعید فاصلہ پر واقع ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ تمام عالم اسلامی میں وہی خلیفۃ المسلمین ہے۔ اور اس لیے گو اور بھی بہت سی اسلامی حکومتیں موجود ہوں، مگر ہر گوشۂ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے۔

صاحب تحفۃ العالم چین کوچک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں۔ جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا۔ "چین کوچک" سے مقصود بحر چین کے جزائر سماٹرا، ملایا جاوا وغیرہ ہیں۔ سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں اور مسجدیں معمور ہیں۔ جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ یہ واقعہ بھی بارہویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔

حاصل کیا گیا تھا، اور جس میں ان کو انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اس کی بنا بھی یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو بحیثیت خلیفۂ اسلام مسلمانانِ ہند کی ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے، کوئین وکٹوریہ کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اُٹھایا گیا، اور پھر امپیریل گورنمنٹ نے باب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ توجہ دلائی کہ بہ حیثیت خلیفۂ اسلام ہونے کے حجاج کی تکلیف دُور کرنا ان کا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبدالحمید خان کے زمانے میں متعدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعتراضات ہو چکے ہیں۔

قرونِ متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی

ہم نے جا بجا "اسلام کی مرکزی حکمرانی" اور "خلافت عظمیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور و اساس مسئلہ "توحید" ہے۔ "توحید" کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہونا۔ صرف اللہ کی ذات و صفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہ تھی جیسا کہ بدقسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ عقائد و اعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں

کیا ہے، اُن سے پوشیدہ نہیں کہ اکثروں نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے۔ جس کے معنی بجز خلافت اسلامیہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامہ صالح مقبلی صاحب العلم الشامخ المتولد ۱۰۴۷ھ علامہ فلانی صاحب ایقاظ الہمم، شیخ عبدالخالق زبیدی صاحب صفوۃ الاخبار وغیرہم اپنی کتابوں میں جابجا ترکی گورنروں کے جبر وستم کی شکایتیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطین عثمانیہ کا ذکر ایسے پیرایہ میں کرتے ہیں جس سے ان کی اسلامی خلافت و امامت کا مسلمہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کرکے یہ کہنا کہ جو شخص آج رُوئے زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلاتے، اس کے گرد اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ جس کے صاف معنی یہی ہیں، کہ سلاطین عثمانیہ، تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ و امام تسلیم کیے جاتے تھے۔

یہ موقع مزید اطناب و تفصیل کا نہیں۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ ہزار صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اس کا ذکر مل سکتا ہے تو پچھلی تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علمائے ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں، اس لیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو جا سکتا ہے۔

خود یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ اقرار کرتی آئی ہے، اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے قسطنطنیہ کی طاقت سے بہ حیثیت خلیفۂ اسلام کے کام لیا گیا ہے۔ غدر ۵۷ء کے موقع پر سلطان عبدالمجید سے جو فرمان مسلمانانِ ہند کے نام

دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن وہاں کا حکمران تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص کشش و دعوت اپنے اندر رکھتا تھا۔ یہ بلاد شام و عراق اور عرب و حجاز کی حکومت تھی۔ عرب اسلام کا اصلی سرچشمہ و مبدا ہے۔ حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے رکن حج کی کارگاہ ہے۔ شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھی جائے۔ شریعت کے اس حکم کی تعمیل و نفاذ کی ذمہ دار اور اقامت حج کی بھی کفیل ہوگی۔ پس قدرتی طور پر یہ بات ہوئی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں مرکزی اقتدار اور تمام مسلمانانِ عالم کے قلوب کے لیے ایک انجذابی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے ازمنۂ متوسط و اخیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافتِ عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصری ہی کے قبضہ میں رہی۔

"مرکزی حکومت" سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطینِ عثمانیہ تمام بلاد عرب و حجاز اور مصر و شام پر قابض ہو گئے تو اسلامی خلافتِ عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلا نزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار صدی کے بعد سے تیرھویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بڑی بڑی اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں۔ لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اٹھتی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ

اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام ان باتوں میں جو فرد و اجتماع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک کامل توحیدی حالت پیدا کر دینی چاہتا ہے جس طرح خدا کی ذات کی طرح اس کی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز پر اور ہر جگہ یگانگی و یک عملی اور وحدت و واحدیت کارفرما ہے۔

"ما تری فی خلق الرحمن من تفوت - فارجع البصر، هل تری من فطور؟ (ملک)

اس بنا پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں۔ ان کی شریعت، ان کا قانون، ان کی کتاب، ان کا نام ان کی زبان ان کی قومیت، ان کا قبلہ ان کا کعبہ ان کا مرکز اجتماع، مرکز ارض، اسی طرح ان کی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی۔ یعنی تمام روئے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو۔ لیکن جہاں ساری باتوں میں انحراف اور تفرقہ و انتشار ہوا وہاں یہ بات بھی جاتی رہی۔ خلفائے راشدین کے بعد صرف بنوامیہ کے ابتدائی عہد تک وحدت حکومت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا، جب تمام عالم اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو۔ مختلف دعویدار اُٹھے اور جس کا قدم بہت جم گیا، خود مختارانہ فرمانروائی کرنے لگا۔

بایں ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرت محسوس کر لیتی ہے۔ کہ اس تفرقہ و انتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے۔ اسلامی حکومتیں ہر گوشۂ عالم میں قائم ہو گئی تھیں۔ مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا جہاں کی حکمرانی

کا مقصد شرعی پچھلی صحبتوں میں صاف ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں کے حملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ اسلام و ملت کے دشمنوں کا استیصال وانسداد ہو۔ کلمۂ حق دنیا میں بلند اور دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے کلمۂ کفر و فساد کو خسران ناکامی نصیب ہو۔ یہی مقصد پہلا مقصد ہے باقی سب فروع و توابع ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے "اقامۃ الدین باقامۃ ارکان الاسلام، والقیام بالجھاد وحفظ حدود الاسلام وما یتعلق بہ من ترتیب الجیوش و الفرض للمتقاتلۃ کے جملے سب سے پہلے ملتے ہیں۔ یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو ارکان اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے اور ان کاموں کے لیے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو اس کا انتظام کرے، مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہو سکتا ہے جو اسلام و ملت کے لیے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دے سکے۔ ساری باتیں ان دو لفظوں میں آگئیں۔

اب فیصلہ کر لو کہ گذشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم نے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دی ہے؟

اسلام کا جب ظہور ہوا تو دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت

سکتا تھا۔

ترکانِ عثمانی اور عالمِ اسلامی

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کرلیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکامِ شرعیہ کی بنا پر سلاطین عثمانیہ کے استعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے۔ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ سہل فیصلہ ہو گا۔

اسلام نے خلیفہ کے نصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیئے ہیں۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں۔ اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران جماعتوں میں کونسی حکومت ایسی ہے جس نے شریعت کے ٹھہرائے ہوئے مقاصد خلافت انجام دیئے! اور جو غرض شرعی خلیفہ کے قیام اور بحکم الذین مکناھم فی الارض تمکین فی الارض سے تھی، وہ ان کے ہاتھوں پوری ہوئی! جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمانانِ عالم کی خلافت و امامت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطروں میں ہو سکتا ہے۔ "خلافتِ اسلامیہ

طاقتوں نے جو مشرقی ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں، بتدریج قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اگر کوئی طاقت ور اور متقادم روک موجود نہ ہوتی تو اب سے دو صدی پیشتر ہی تمام وسط ایشیا شام، عرب اور اسلامی افریقہ یورپ کے استیلاء سے پامال ہو چکا تھا۔

پھر وہ کونسی ناقابل تسخیر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے پے در پے حملوں سے تمام یورپ کو اس طرح پامال کر دیا کہ پوری دو صدیوں تک سنبھلنے اور قدم اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی اور پھر تمام ایشیا و بلاد اسلامی کے عین دروازہ پر مغربی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم کر دی اور اس طرح حکم جہاد کے دونوں فرض بہ یک وقت تن تنہا انجام دیئے۔ ہجوم بھی، اور دفاع بھی۔

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں ایک بار بھی ہندوستان سے قدم باہر نہ نکالا اور جس کی تلوار پانچ صدیوں کے اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف متش کے خون سے رنگین نہ ہوئی! عین اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرتگالیوں اور ڈچوں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوٹ رہے تھے اور وہ ان کے انسداد سے عاجز تھا۔

کیا ایران کے سلاطین نے، جن کے عقبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مندانہ اقدام ترک کر کے ایشیا کی طرف متوجہ ہو جائیں جس کی وجہ سے یکایک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت مل گئی اور تمام

تھی۔ ان کے مٹ جانے کے بعد ان پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں کی دائمی حریف رہی ہیں۔ دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا داعیہ ہو۔ ایران کی مجوسی قوت کا ابتداء ہی میں خاتمہ ہوگیا تھا۔ یہودیوں کی کوئی پولیٹیکل قوت نہ تھی۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروؤں نے ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ ان میں کوئی داعیانہ قوت تھی۔ چین کے تاتاری اُٹھے اور بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت کا باعث ہُوئے۔ لیکن بالآخر خود اسلام کے محکوم ہوگئے۔ یعنی ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان ہوگئے۔

پس تمام رُوئے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے اور کوئی حملہ آور حریف اسلام کا نہ تھا۔ نہ ہے؟ مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتداء ہی میں شکست ہوگئی تھی۔ صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جن کو خواہ مسیحیت کے نام سے موسوم کرد خواہ یورپ کے نام سے۔ یہی آخری چار صدیوں میں جن میں بتدریج یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی اور اس کی ترقی کا دُوسرا رُخ یہ تھا۔ کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کو روز افزوں تنزل ہُوا۔

تمام کرّۂ ارضی کے مسلمانوں میں سے کونسی قوم ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر یورپ کا معاملہ کیا ہے اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی اُس کے سب سے بڑے حریف کے مقابلے میں حفاظت کی ہے! سولھویں صدی عیسوی ہی میں یورپ کی ان تمام

پسند کی۔ ان قرونِ اخیرہ میں اگر تُرکوں کی جانفروش و سرباز جماعت تنِ تنہا اس فرض کو نہ سنبھال لیتی تو نہیں معلوم آج جغرافیہ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اس وقت درپیش ہے وُہ کب کی آچکی اور مسلمانوں پر سے گذر چکی ہوتی! تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسانِ عظیم ہے کہ اگر اس کے معاوضہ میں مسلمانانِ عالم اپنا سب کچھ ان پر سے قربان کر دیں، جب بھی اُن کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اگر گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف اُنھی کی بدولت اور آج پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پونجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف انھی کی بدولت مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصّہ میں بستا ہو، چین میں ہو یا افریقہ کے بعید گوشوں میں، لیکن صدیوں سے اس کی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کے لیے ہے اور ہو سکتا ہے، صرف تُرکوں ہی کے طفیل ہے اور انھی کا بخشا ہوا یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں لیکن ترکوں کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہندوستان یا افریقہ میں بانٹنے کے لیے روپیہ بھیجتے رہے۔ دو چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جس کے تصوّر سے بھی ہم مسلمانانِ ہند کے دل کانپ اُٹھتے اور جس کے وہم ہی سے ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں اس سے بڑھ کر اور کونسا کام ہے جو

وسط یورپ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔

کیا یمن کے خود مختار قبائل اور عرب ائمہ نے، جن کو اسلام کے اس سب سے بڑے حریف کا شائبہ حال بھی معلوم نہ تھا۔

ہر انسان جو دو اور دو کو صرف چار ہی کہنا چاہتا ہو، اس کا اقرار کرے گا کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کو کوئی حکومت اور قوم نہیں ہے جس نے قرون اخیرہ میں حفظ اسلام و ملت کی یہ خدمت انجام دی ہو۔ اور جو فرض تمام مسلمانانِ عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا، اس کو سب کی طرف سے تن تنہا اُٹھا لیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی نظیر قرون اولیٰ کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمران قوم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی۔ تاہم وُہ بھی ایک محدود زمانے کا دفاع تھا۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام روئے زمین کے مسلمان اپنے سب سے بڑے قومی فرض سے غافل رہے کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اس کے لیے نہیں اُٹھایا۔ صرف تن تنہا ترک ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تمام مسلمانانِ عالم کو عیش و راحت کے بستروں پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک و خون کی دائمی زندگی

یاعابد الحرمین لو ابصرتنا ۔۔۔ لعلمت انک فی العبادۃ تلعب
من کان یخضب خدہ بدموعہ ۔۔۔ فنحورنا بدمائنا تتخضب
ریح العبیر لکم ونحن عبیرنا ۔۔۔ وھج السنابک والغبار الاطیب[1]

جو مسلمان یورپ کے مسیحی و سیاسی اثر سے مختل ہو کر ترکوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں، ان کو چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے ان کی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا حال رہا ہے؟ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو (جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں) غور کرنا چاہیے کہ جس اوّلین فرض دینی کے لیے ترک چار سو برس سے پیا خون بہا رہے ہیں۔ انھوں نے اس کے لیے کیا کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ

---

[1] حافظ ابن عساکر نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درسِ حدیث دیتے۔ ایک سال تجارت کرتے۔ ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے حضرت فضیل اس عہد کے مشہور عبّاد و زہّاد میں سے ہیں۔ حاصل ان اشعار کا یہ ہے:
"اُے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تو ہمارا حال دیکھتا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے رخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) تر کرتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری عبادت وُہ ہے جس میں رخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور فرمایا "صدق ابو عبدالرحمٰن" عبداللہ بن مبارک نے سچ کہا۔

اور مسلمانوں کے پیے کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے بعد کیا رہ گیا جس کی طلب اور سوال ہو؟ بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصّے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں۔ لیکن نماز کے قیام کی راہ میں اُن سے زیادہ اپنا خون کسی نے نہیں بہایا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے اُن سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو۔ لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف انہی کے سینے کھا رہے ہیں اگر اللہ کی شریعت حق ہے اگر قرآن و سنت کا فیصلہ باطل نہیں تو ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد مسلمانوں سے جن کے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گزرتا، ترکوں کا ایک گناہگار و معصیت آلود فرد بھی اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے، ہماری مدت العمر کی عبادتیں بھی ان کے سینے کے ایک خونچکاں زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرۂ خون کی عظمت نہیں پا سکتیں۔

حدیث ہے کہ "حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ یقام لیلہا و یصام نہارھا" (۱) جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے! حضرت عبداللہ ابن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے۔

---

(۱) اخرجہ الامام احمد عن مصعب بن زبیر۔

فریضۂ عظیمہ دفاع

حقیقت حکم دفاع

اسلام کے شرعی واجبات و فرائض ہیں۔ ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان و کفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض " دفاع" ہے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے، تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پہ شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (ڈیفنس) کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر بچائیں اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں، اور اس کام کے لیے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں، اور اسلامی فرائض میں یہ اس درجہ مشہور فرض ہے، کہ شائد ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے ناواقف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاوری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں، لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ سورۃ حج میں ہے۔

ان اللہ یدافع عن الذین	اللہ تعالیٰ مومنوں پر سے ان کے دشمنوں
اٰمنوا ان اللہ لایحب کل خوان	کو ہٹاتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی

کبھی کبھار چند لاکھ سکے ترک زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے بھیج دیئے جو ایک ترک بیوہ کی مصیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہو سکتے کیا ایسے لوگوں کو جو اپنی راتیں فارغ البالی کے بستروں پر اور دن آرام و بے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ اُن لوگوں پر زبان طعن کھولیں جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں؟

بہرحال منصب خلافت کا پہلا مقصد قیام دفاع و جہاد ہے۔ وُہ پچھلی چار د یوں میں بجز ترکوں کے اور کسی حکومت نے انجام نہیں دیا۔ پس اگر اور دلائل و شواہد نہ ہوتے، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کے لیے کفایت کرتی تھی۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام مبحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گزشتہ صدیوں میں متعدد اسلامی حکومتوں کے رہتے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے؟ کیوں موجودہ زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مٹ چکی ہیں۔ مسلمانان عالم کے لیے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود ہی نہیں رہا۔

لا یحب المعتدین واقتلوھم	اللہ حد سے گزر جانیوالوں کو پسند نہیں
حیث ثقفتموھم واخرجوھم	کرتا۔ اور ایسا کرو کہ جہاں کہیں بھی وہ
من حیث اخرجوکم والفتنۃ	جسے ہوئے ملیں، قتل کرو اور جہاں کہیں
اشد من القتل	سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا ہے تم

بھی نکال باہر کرو۔ ایسا کرنا اگرچہ خونریزی ہے مگر خونریزی کی برائی سے بھی بڑھ کر ظلم و فساد کی برائی ہے۔

امام ابن جریر نے ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت یہی پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی۔ انھا اول ایۃ نزلت فی القتال بالمدینۃ فلما نزلت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل من قاتلہ ویکف عمن کف عنہ، حتی نزلت سورۃ براءۃ" پس اذن قتال کی پہلی آیت یا سورۃ حج کی ہے یا بقرہ کی۔

ان دونوں آیتوں اور ان کی ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے اس حصہ کو صاف صاف مسلمانوں پر فرض کر دیا جس کا مقصد دفاع (ڈیفنس) ہے[1] یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی کوئی جماعت مسلمانوں کی کسی حکومت یا آبادی پر حملہ کرے، یا اُس پر خود قابض ہو جانا چاہے تو

---

[1] یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک قسم قتال ہے۔ پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں۔ دفاع اور ہجوم، ان آیات میں دفاع کا حکم ہے۔ ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے اور اس کے مواقع و بواعث اور شرائط دوسرے ہیں۔

كفروا اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير، الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا ان يقولوا ربنا الله۔	نہیں جو اس کی بخشی ہوئی طاقت کے امانتدار نہیں ہیں، اور شکر گذاری کی جگہ کفران نعمت میں سرشار ہیں جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں، اب ان مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ مظلوموں

..... کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیئے گئے، ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین نے سورۂ بقر کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہِ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ	اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑ جو مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو

---

[1] روی الحاکم من حدیث الاعمش عن ابن عباس قال لما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ قال ابو بکر اخرجوا نبیھم انا للہ وانا الیہ راجعون لیھلکو فانزل اللہ اذن للذین یقاتلون الخ وھی اول ایۃ فی القتال اسنادہ علی شرط الصحیحین۔

جاتے۔ ساری دنیا ایک قوم، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کریں۔ لیکن جب تک جنگ کرنے والی ظالم وحریص قوتیں باقی ہیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس پہلے مفسد وجابر قوتوں کا مقابلہ کرنا اور ان کو فنا کر دینا ضروری ہوا مضبوط اور مستقل امن اسی وقت قائم ہوگا۔ جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے:

حتیٰ اذا اثخنتموھم، — یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا۔ مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہوگا۔

ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الالباب — تمہارے لیے قصاص کی موت میں امن کی زندگی پوشیدہ ہے۔

لہٰذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور بواعث جنگ سے باز نہ آ جائے جنگ کرتے رہو، کبھی اس سے نہ تھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں جنگ کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے۔ "تضع الحرب اوزارھا" جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد وبطلان کی وہ قوتیں ہی باقی نہ رہیں جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے رنگتی رہتی ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر ضرور آئے گا، مگر اسی وقت آئے گا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن واخوت کے آگے جھک جائے گی: ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح حملہ آوروں نے حملہ کیا ہے، یہ بھی کریں، قتل و جنگ کی جو جو چال وُہ چلے ہیں، یہ بھی چلیں۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں رحم و عدل کے جو حدود شریعت نے باندھے ہیں مثلاً ضعیفوں، بوڑھوں، بوڑھیوں، نہتوں، عورتوں، راہبوں، مذہبی عبادت گاہوں وغیرہ سے تعرض نہ کرنا، ان سے قدم باہر نکالیں۔ پھر اس حکم کی علت بھی بتلادی کہ " الفتنۃ اشد من القتل" بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی بُرائی ہے۔ لیکن اس بُرائی سے بھی بڑھ کر بُرائی یہ ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قانع نہیں رہتے دوسروں کے حقوقِ آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں۔ قوموں کا قدرتی حق حریت پامال کر رہے ہیں۔ اگر اس کے دفع کا انتظام نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ و باقی نہیں رہ سکتی۔ پس بڑی بُرائی کے دور کرنے کے لیے چھوٹی برائی اختیار کر لینی چاہیئے۔ یہ خود نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا دائمی عمل ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

سورۂ محمدؐ میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بھی بتلا دی ہے۔

حتی تضع الحرب اوزارھا — لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہو جائے۔

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم ہو

الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ ؟ اذ قالوا لنبی لهم، ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل الله قال هل عسیتم ان کتب علیکم القتال ان لا تقاتلوا قالوا وما لنا ان لا نقاتل فی سبیل الله وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا ؟ فلما کتب علیهم القتال، تولوا الا قلیلا منهم والله علیم بالظٰلمین ،

کیا بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے کہ موسیٰؑ کے بعد کیا ہوا؟ پہلے تو خود ہی اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی "کسی کو ہم پر پادشاہ بنا دو کہ اُس کے ماتحت اللہ کی راہ میں لڑیں" نبی نے کہا" اگرچہ تم ایسا کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے اترو اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو بُزدلی دکھلا کے نافرمانی کر جاؤ گے" ان لوگوں نے جواب دیا" ںتیں ایسا نہیں ہو سکتا ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ حق کی راہ میں ظالموں سے جنگ نہ کریں؟ حالانکہ انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے شہروں سے نکال دیا ہے لیکن دیکھو، جب لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول و اقرار سے پھر گئے۔ وقت پر ان کا دعویٰ سچا ثابت نہ ہوا۔

سنن ابوداؤد میں ہے:" اذا ضن الناس بالدینار والدرهم وتبایعوا بالعین واتبعوا اذناب بقر وترکوا الجهاد فی سبیل الله، انزل الله بهم بلاء فلم یرفعه حتی یراجعوا" یعنی جب کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دُور نہیں ہو سکتیں

ولو کرہ المشرکون

فضائلِ دفاع

اسلامی احکام میں یہ حکم "دفاع" جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قومی زندگی اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا، اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہ آ سکے گی۔ جس دن یہ جذبہ مُردہ ہو جائے گا۔ اس دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت و عزت انہی کے لیے تھی۔ جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب غالب آ گیا، اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا، اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے: ضربت علیهم الذلة والمسکنة و باؤا بغضب من

روزے بھی اس ایک قطرۂ خون کی فضیلت و تقدیس نہیں پا سکتے جو اس راہ میں بہایا گیا اور عمر بھر کی صدقات و خیرات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ حتیٰ کہ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصل پہچان قرار پایا۔ جس مسلمان کا دل اس کے ولولہ و طلب سے خالی ہوا وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہو گیا۔ نفاق کی ظلمت اس پر چھا گئی۔ صحیح مسلم میں ہے۔

من مات و لم یغزو لم یحدث نفسه به، مات علیٰ شعبة من النفاق۔	جو مسلمان اس حالت میں دُنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی اور نہ اس کے دل میں اس بات کی طلب رہی، اس کی موت ایسی حالت میں ہوتی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔
(عن ابی ھریرۃ)	

قرطبی نے اس کی شرح میں کہا: فیه دلیل علیٰ وجوب العزم اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو وہ مومن نہیں ہے۔ منافق ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان چاہیں تو اس فرمان رسول کو سامنے رکھ کر اپنے ایمان و نفاق کا فیصلہ کر سکتے ہیں!

ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا" ای الاعمال احب الی اللہ" ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے

الا یہ کہ وُہ اس مصیبت سے باز آئیں۔

چونکہ شریعت وملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی تھی۔ اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا۔ اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ واجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہو گی، اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔

کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں۔ ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مسلم و مومن زندگی کے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے۔ یہی ستونِ دین ہے۔ یہی عماد ملت ہے۔ یہی اساس شرع ہے، یہی املاک اسلام ہے۔ یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے، یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصلی پہچان ہے۔ نماز اسی سے ہے، روزہ اسی سے ہے، حج اسی سے ہے۔ زکوٰۃ کا سب سے پہلا اور افضل مصرف یہی ہے۔ سب اس کے لیے ملتوی ہو جا سکتے ہیں۔ اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کی ڈھال، لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کر دینے والی تلوار۔ پس اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے، نہ روزہ، نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے، ہزاروں نمازیں اور ہزاروں

کیا گیا" ای العمل افضل ؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا: "ایمان باللہ ورسولہ" اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا، "ثم ماذا" اس کے بعد؟ فرمایا: الجھاد فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں جہاد!

بخاری میں ابو سعید خدری سے ہے قیل ای الناس افضل؟ فقال مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ و مالہ آپ سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ افضل آدمی کون ہے؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے۔

اور فرمایا: لغدوۃ فی سبیل اللہ اور روحۃ خیر من الدنیا وما فیھا اور خیر مما تطلع علیہ الشمس و تغرب (بخاری) جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔

بخاری میں دو حدیثیں ہیں (۱) مامن عبد یموت لہ عند اللہ خیر یسرہ ان یرجع الی الدنیا وان لہ الدنیا وما فیھا الا الشھید (۲) لما یری من فضل الشھادۃ فانہ یسرہ ان یرجع الی الدنیا فیقتل مرۃ اخری" اور روایت انس" ما احد یدخل الجنۃ یحب ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامۃ، حاصل دونوں کا یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ جب وہ شہادت کا اجر و ثواب

زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے اس پر سورۃ صف نازل ہوئی[1]

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص!

اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماؤ سے لڑتے ہیں گویا ایک دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کردی گئی ہے اور دیوار بھی کیسی! ایسی جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو!

پھر اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا۔ یہی وہ عمل ہے جس کے کرنے کے بعد تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، کوئی خطا، کوئی معصیت، کوئی برائی باقی نہیں رہتی۔ ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھل جاتا ہے یا ایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم؟ تومنون باللہ و رسولہ، و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنٰت تجری من تحتھا الانھار ومساکن طیبۃ فی جنات عدن ذلک الفوز العظیم!

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، آنحضرتؐ سے سوال

---

[1] واخرجہ ایضا امام احمد عن عبداللہ بن سلام وابن ابی حاتم وابن حبان والحاکم وقال صحیح علیٰ شرط الصحیحین، والبیھقی فی شعب الایمان والسنن والطبری فی التفسیر،

ہوا کہ عمل دفاع کے لیے اپنا مال ومتاع قربان کرنا خدا ورسول کی نظروں میں ایسا محبوب ومحترم کام ہے، جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کسی عمل، کسی طاعت، کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نصیب نہ ہوئی۔

ترمذی میں ہے "من رابط لیلۃ فی سبیل اللہ کانت لہ کالف لیلۃ صیامھا وقیامھا" جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی، اس کے لیے ایسا اجر ہے، گویا ہزار دنوں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت!

اور فرمایا: مقام احدکم فی سبیل اللہ خیر من عبادۃ احدکم فی اھلہ ستین سنۃ (ترمذی) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ۔

اور فرمایا: حرس لیلۃ فی سبیل اللہ، افضل لہ من الف لیلۃ، یقام لیلھا ویصام نہارھا" (رواہ احمد) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں!

اور فرمایا حرمت النار علی عین دمعت من خشیۃ اللہ و حرمت النار علی عین سھرت فی سبیل اللہ (ایضاً) جو آنکھ اللہ کے خوف سے اشکبار ہوئی، یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے!

دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے۔ کاش پھر دنیا میں جا سکوں اور دس مرتبہ اسی طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور ہر مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل کروں۔

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جان نثاریاں کی تھیں، اگر کبھی ان سے لغزش ہوئی اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے تو آپ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا لعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم یہ وہ جان نثار ہیں جنہوں نے جنگِ بدر میں شرکت کی ہے۔ عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو جی میں آئے کرو:

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی تیاریوں کی خبر پہنچی تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا۔ حضرت عثمان نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا، جو شام جانے کے لیے تیار ہوا تھا اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے۔ اور دو سو اوقیہ سونا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا لا یضر عثمان ما عمل بعدھا آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا (اخرجہ الترمذی والحاکم ایضا من حدیث عبد الرحمٰن بن حباب نحوہ)

سبحان اللہ! اس عمل عظیم کی برکت و بخشش! اس حدیث سے معلوم

فیھا حرام علی النار" (رواہ احمد) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کے لیے بھی گرد آلود ہوتے، دوزخ کی آگ ان قدموں پر حرام ہے۔

امام بخاری نے اسی حدیث کو یوں روایت کیا ہے: "ما اغبرت (وفی روایۃ المستملی "اغبرتا" بالتثنیۃ) قدما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار" ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس بندے کے پاؤں جہاد کی راہ میں غبار آلود ہوتے ہوں، ان کو جہنم کی آگ بھی چھو سکے۔ حافظ عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ اس حدیث سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و فضیلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب صرف غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ ان پر حرام ہو جاتی ہے، تو جو خوش نصیب جہاد و دفاع میں کمال سعی و تدبیر کرے اور اپنی جان اور مال کو اس کے لیے وقف کر دے۔ اس کے اجر و ثواب کا کیا حال ہو گا؟ اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے؟ فاللہ یضاعف لمن یشاء اور فرمایا ما من میت یموت الا ختم عملہ، الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ فانہ ینمو لہ عملہ الی یوم القیٰمۃ وامن من فتنۃ القبر" (رواہ اصحاب السنن) کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا۔ سو اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔

یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے۔ حسنات جاریہ بموجب نص

ایک شخص نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! کوئی ایسا عمل بتلا دیجیے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو فرمایا: "هل یستطیع ان تصلی فلا تفتر و تصوم فلا تفطر؟" اس کی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قضا نہ ہو برابر روزہ رکھتے رہو اور کبھی بیچ میں افطار نہ کرو؟ عرض کیا انا اضعف من ان استطیع ذلک" یہ تو میری طاقت سے باہر ہے۔ فرمایا: فوالذی نفسی بیدہ! لوطوقت ذلک، ما بلغت فضل المجاهدین فی سبیل اللہ اما علمت ان فرس المجاهد لیستن فی طولہ فیکتب لہ بذالک الحسنات خدا کی قسم! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے جب بھی ان لوگوں کی فضیلت کہاں پا سکتے تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں؟ (رواہ احمد والیضا رواہ البخاری باختلاف یسیر)

بخاری و مسلم میں ہے۔ تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا۔ "ما یعدل الجهاد فی سبیل اللہ؟" کونسا کام ہے جو جہاد کے برابر درجہ و فضیلت رکھتا ہو؟ تین مرتبہ فرمایا: "لا تستطیعونہ" تم اس کی طاقت نہیں رکھتے یعنی کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو جہاد کے برابر درجہ رکھتا ہو اور تم کر سکو، پھر فرمایا: مثل المجاهد کمثل الصائم القائم القانت بایات اللہ لا یفتر عن صلاۃ ولا صیام حتی یرجع

اور فرمایا: من اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ ساعۃ من نهار

الذین آمنوا و ھاجروا و جاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم و انفسھم، اعظم درجۃ عند اللہ واولٰئک ھم الفائزون۔ یبشرھم ربھم برحمۃ منہ و رضوان وجنات لھم فیھا نعیم مقیم خالدین فیھا ابدا ان اللہ عندہ اجر عظیم

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے جہاد کیا سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اور اونچا درجہ انہی کا ہے، یہی لوگ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے، اللہ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے اس کی رحمت، اس کی محبت، بہشتی زندگی کی نعمتیں اور ان کی دائمی اور ہمیشگی سب کچھ ان ہی کے لیے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و دفاع میں حصّہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں، یا اور کسی طرح کی خدمت انجام دیں تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے، لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے، اور ساری عبادتوں اور طاقتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔

ابن ماجہ میں ہے "من رسل بنفقۃ فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ، فلہ بکل درھم سبع مائۃ درھم ومن غزا بنفسہ فی سبیل اللہ وانفق فی وجھہ ذلک، فلہ بکل درھم سبع مائۃ الف درھم، ثم تلا ھذہ الآیۃ۔ واللہ یضاعف لمن یشاء" یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے روپیہ سے جہاد میں مدد دی تو اس کو ہر ایک روپیہ کے بدلے سات سو روپیوں کا اجر

حدیث مسلم تین ہیں۔ اولاد صالح، علم نافع، اوقاف و تعمیرات خیریہ۔ مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو باقی رہیں۔ اس حدیث اور اس کی ہم معنیٰ احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ علت اس کی بالکل واضح ہے۔ عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کے لیے اپنا وجود قربان کر دیا جائے پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوع پرستی کے جذبات رکھتا ہو۔ اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی وقتی نہ ہو۔ دائمی ہو۔ عمل کا اجر تو عمل کے نتائج پر موقوف ہے۔ جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملیں گے تو صاحب عمل کا اجر ابھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے

اس حدیث میں "مرابطاً فی سبیل اللہ" کا لفظ آیا ہے اور دوسری حدیثوں میں بھی جا بجا "رباط" کا لفظ وارد ہے۔ "رباط" سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں ٹھہر کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا، تاکہ جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے۔ نہایہ میں ہے "ھوالاقامۃ فی ماکات یتوقع ھجوم العدو فیا لقصد دفعہ اللہ" پس مرابطاً فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لڑ کر شہید ہونے کا موقع نہیں ملا اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی، جب بھی اس کا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہے گا اور وہ ہزار دنوں کے روزہ و نماز سے بھی افضل ہے! اسی بنا پر امام بخاری و امام نوادی وغیرہما نے فضل الرباط فی سبیل اللہ کا باب باندھا ہے۔

قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے:

کی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے، اُس کے رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں۔ پس اگر اس کے کام کا وقت آگیا تو سب کو اس کی خاطر چھوڑ دینا پڑے گا:

قل ان کان اباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومساکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره والله لا یهدی القوم الفاسقین

مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے والدین تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور اس کے تمام رشتے، یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے۔ یہ کاروبار تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، یہ تمہارے رہنے کے محل جن میں تمہارا دل اٹکا ہوا ہے۔ اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں، اور تمہارے پاؤں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی انہیں تہیں ہلا سکتی، تو جاؤ کہ اللہ کا کام بھی تمہارا محتاج نہیں۔ نتائج کا انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا منظور ہے کر دکھائے۔ اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا!

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اس وقت لازم سے الزم ہو جاتی ہے، جب حملۂ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش نہ آجائے لیکن

ملے گا۔ یعنی اس انفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے اور جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک کار ہوا، تو اس کے لیے سات ہزار درجہ زیادہ اجر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی "اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے، دوگنا کر دیتا ہے۔

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے "فضل من جھز غازیا اس میں زید بن خالد کی حدیث لاتے ہیں "من جھز غازیا فی سبیل اللہ فقد غزا ومن خلف غازیا فی سبیل اللہ بخیر فقد غزا"۔ یعنی جس نے مجاہد و غازی کے سامان کا انتظام کر دیا تو گویا اُس نے خود جہاد کیا۔ اور جس نے اس کے پیچھے اُس کے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اس کے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے!

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے، معلوم ہے، علی الخصوص والدین اور اقربا کے حقوق، کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے جس کے لیے یہ حقوق بھی روک نہیں ہو سکتے۔ اُمت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت موقوف ہے۔ پس اگر اُمت دشمنوں کے نرغہ میں ہے، تو نیکی کا سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ اب اس بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، رشتے ناتے، اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں، سب کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ لیکن خدا اور اس

نے بھی تیاری کا حکم دے دیا، اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا
چونکہ یہ فوج بڑی ہی تنگدستی اور بے سروسامانی کے حال میں نکلی تھی۔
اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آئی تھی۔ جنگل کے پتے کھا کر
لوگوں نے گزارہ کیا تھا، اس لیے اس فوج کا نام "جیش العسرۃ"
مشہور ہوا۔ الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ

آج تم خدا اور اس کے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان و
اسلحہ کی پرستش کر رہے ہو۔ لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب بے سروسامان
مسلمانوں کی یہ بھیڑ نکلی تھی، تا کہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی
رومیوں سے مقابلہ کرے!

حضرت ابو بکرؓ نے اسی دفاع کے لیے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا۔
جب ان سے پوچھا گیا "ما ابقیت لاھلک" اپنے بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ
آئے ہو؟ تو اس پیکر ایمان و مجسمۂ عشق حق نے جواب دیا تھا "ابقیت لھم
اللہ و رسولہ" اللہ اور اس کے رسول کو!

آنکس کہ ترا بخواست، جاں را چہ کند؟
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی!
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند؟

تبوک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دلیرانہ تیاریوں کا
حال سن کر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر کر دی گئیں۔

عزم و استقلال کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کے لیے تیار رہیں اور تیاری کرتے رہیں۔ اوپر حدیث گذر چکی ہے کہ جو دل اس کے عزم و طلب سے خالی ہُوا، اس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہوگیا:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم واٰخرین من دونھم لا تعلمونھم

جس قدر بھی تم سے ممکن ہو، دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنی قوت اور ساز و سامان سے تیار رہو تا کہ تمہاری مستعدی دیکھ کر اللہ اور تمہارے دشمنوں پر خوف اور رعب چھا جائے تم پر حملہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہو۔

عہدِ نبوّت کا ایک واقعہ

یہ قرآن و سنّت کے احکام ہیں۔ اب دیکھیں، صاحب شریعت کا اس بارے میں طرزِ عمل کیا رہا ہے؟

ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے۔ یہ سُن کر آپ

نکلتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔ ایک دن اپنے چچیرے بھائی ابوقتادہ کے یہاں گیا۔ مجھے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سلام کیا تو جواب نہ ملا۔

اللہ اللہ! کیا مسلمان تھے کہ ان کا رشتہ تھا تو اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ، زندگی تھی تو صرف اسی کے حکم پر! الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے!

غسان کے عیسائی بادشاہ نے یہ حال سُنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا اچھا موقع نکل آیا ہے۔ کعب کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر بھیجا کہ تمہارے آقا نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا جو معاوضہ دیا ہے وہ دیکھ چکے ہو۔ اب میرے پاس چلے آؤ۔ دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے؟ کعب بن مالک کو خط ملا تو ایلچی کے سامنے آگ میں جھونک دیا اور کہا: جواب میں کہہ دینا۔ ہم نے جس آقا کی چوکھٹ پر سر رکھا ہے اس کی گہرائیوں اور دلربائیوں کا حال تمہیں کیا معلوم؟ اس کی بے التفاتی بھی دوسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ زیادہ عزیز و محبوب ہے:

اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی بالآخر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وعلی الثلٰثۃ الذین خلفوا	اور وہ تین آدمی جن کا معاملہ فیصلہ الٰہی
حتی اذا ضاقت علیہم الارض	کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا سو جب

آنحضرتؐ نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔

اس وقائع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک تھے ؛ صرف تین شخص نہ جا سکے۔ کعب بن مالک ، ہلال بن امیہ ، مرارہ بن ربیع ، کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں اور ان ۷۳ سابقین مخلصین میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کے ایمان واخلاص میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ ان کا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا۔ سستی اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقع نکل گیا۔

بایں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی نظروں میں اس درجہ اہم ہے کہ اتنی سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی۔ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور فیصلۂ وحی کا انتظار کرو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات اُن سے ترک کر دیں۔ نہ کوئی بات چیت کرے نہ ملے جُلے نہ اور کسی طرح کا واسطہ رکھے پھر ان کی بیبیوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ امام بخاری نے ایک طویل طویل روایت خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کے لیے خاص باب باندھا ہے۔ کعب کہتے ہیں ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا مدینہ انسانوں سے بھرا تھا۔ مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک بات کرنے والی زبان ، خود عزیز واقارب نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ حسرت سے ایک ایک کا منہ

کہ سب کچھ چھوڑ دو۔ ساری مصیبتیں جھیل لو۔ مگر دشمنوں کو روکنے کے لیے نکل کھڑے ہو۔ سورۂ توبہ میں اس کا بڑا ہی عبرت انگیز تذکرہ ہے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔ قالوا لاتنفروا فی الحر قل نار جهنم اشد حرا لو کانوا یفقهون

(۲) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے، مخلصین مومنین میں سے تھے، ان کی زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جان نثاریوں میں بسر ہوئی تھیں، عبادتوں اور نیکیوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایۂ تربیت میں رہتے تھے۔ ان ہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کرکے بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت کعب بن مالکؓ سابقون الاولون میں سے ہیں۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی۔ یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا۔ ہر جنگ میں شرکت کی، ہر موقع پر جان و مال نثار کیا۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے، تو دل کی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں، چلنے کا پورا سامان کر لیا تھا۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا۔ تاہم دیکھو یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسا بڑا جرم قرار پائی، کہ

بما رحبت و ضاقت علیهم انفسهم وظنوا ان لا ملجأ من الله الا الیه ثم تاب علیهم لیتوبوا ان الله هو التواب الرحیم۔

ان کا یہ حال ہوا کہ تمام مسلمانوں نے ان کو چھوڑ دیا، زمین باوجود اپنی وسعت کے ان پر تنگ ہو گئی اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے اور انھوں نے دیکھ لیا، کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف، تو پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اور خطا کاروں کے لیے مہربانی رکھتا ہے:

حضرت کعب کو جب قبولیتِ توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور اپنا سارا مال ومتاع شکرانۂ قبولیت میں لٹا دینا چاہا۔

اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں:

(۱) رومیوں نے حملے کی تیاریاں کیں تو اسلام واُمت کی حفاظت کے لیے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو گیا۔ موسم سخت گرمی کا تھا۔ سفر دُور دراز کا، بے سروسامانی حد درجہ کی۔ مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دُنیا پر حکمران تھی۔ حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اسی وقت تھا۔ یہی فصل ملک کے لیے سال بھر کی خوراک تھی۔ اگر مشکلوں اور مجبوریوں کے عذر سُنے جا سکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھ کر اور کون سے حالات عذر داری کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سُنا گیا، نہ کوئی مشکل رکاوٹ ہو سکی۔ حکم ہُوا

(۴) جب ان پاک انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان ان کا ایمان تھا، اور نیکیاں ان کی نیکیاں تھیں، ان کے بستر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں، تو خدارا بتلاؤ، ہم بدبختوں اور سیہ کاروں کا کیا حشر ہو گا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ اطاعت و حسنات کی پونجی دامن میں۔ زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت، اور عمریں یک قلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی۔ وہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہو و نسیان، تھا۔ مگر عذر قبول نہ ہُوا۔ یہاں اغراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ ندامت ہے نہ توبہ و انابت۔ ان کے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بیخوفی کی موت چھا گئی ہے؟ بتلاؤ زمین و آسمان میں کون ہے جو اس دن ہمیں بچا سکے گا۔ جب خدا کے غضب کا بے پناہ ہاتھ ہماری طرف بڑھے گا۔

ایک عام غلط فہمی

البتہ یاد رہے کہ جہاد کی حقیقت کی نسبت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی

نہ تو کوئی پچھلی خدمت آڑے آسکی، نہ مدت العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے کچھ کام دیا۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیع ہوسکی، نہ ایک ایسے پکے اور پرکھے ہوئے مخلص مسلمان کے لیے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی۔ سخت سے سخت سزا جو دی جاسکتی تھی، دی گئی۔ مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ توڑ دیا گیا۔ پچاس دنوں کے لیے جماعت سے باہر کر دیئے گئے، یہ سارا زمانہ گریہ وزاری اور عبادت و استغفار میں بسر ہوا۔ تب کہیں جاکر توبہ قبول کی گئی۔

(۳) اسلام کے احکام کا قبولیتِ توبہ کے بارے میں جو حال ہے، معلوم ہے۔ خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا جس قدر اس مضطرب روح کا، جو توبہ کے لیے اس کی طرف بڑھے، "لو اخطاتم حتی تملا خطایاکم ما بین السماء والارض ثم استغفرتم اللہ یغفرلکم" (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کا فاصلہ ان سے بھر دیا جاسکے، پھر بھی توبہ کے آنسو بہاتے ہوئے آؤ تو دروازۂ مغفرت کھلا پاؤ گے، لیکن دیکھو، امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکایک توبہ بھی قبول نہ ہوئی۔ تینوں صحابی آپ کی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عفو تقصیر کے لیے حاضر ہوگئے تھے، مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں، انتظار کرو۔ پچاس دن سزا و عقوبت کے گزر چکے تب کہیں جاکر توبہ قبول ہوئی۔

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی ہر صبح و شام جہادِ حق میں بسر کرتا ہے۔ مشہور حدیث ہے "المجاھد من جاھد نفسہ فی ذات اللہ، والمھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ"

سورۂ فرقان میں ہے فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً یعنی کفار کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا جہاد کرو۔ سورۂ فرقان بالاتفاق مکی ہے اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ مکی زندگی میں کونسا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً وہ حق کی استقامت اور اس کی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا نام جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا، سب کو معلوم ہے، حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی جیسی اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں نے مکی زندگی میں برداشت کیں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم حالانکہ منافق تو خود اسلام کے ماتحت مقہورانہ و محکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے، ان سے جنگ و قتال کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ اُن سے کبھی جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت و مقاومت فساد کا جہاد تھا جو قلب و زبان سے تعلق

ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں، مخالفین اسلام بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دیتا ہے۔

"جہاد" کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ سعی کو جو ذاتی اغراض کی جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے۔ "جہاد" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، انفاق وقت و عمر سے بھی ہے۔ محنت و تکالیف برداشت کرنے سے بھی ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے۔ جس سعی کی ضرورت ہو اور جو سعی جس کے امکان میں ہو اس پر فرض ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغت و شرع دونوں اعتبار سے داخل۔ یہ بات نہیں ہے کہ "جہاد" سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی و لسانی پر نہ ہوتا۔ حالانکہ کتاب و سنت ایسے اطلاقات سے لبریز ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحب اقناع نے نقل کیا ہے جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل و جامع ہے الامر بالجهاد منه ما يكون بالقلب كالعزم عليه، ومنه ما يكون باللسان كالدعوة الى الاسلام والحجة والبيان والرائے والتدبير فى ما فيه نفع المسلمين وبالبدن اى القتال بنفسه فيجب الجهاد بغاية ما يمكنه من هذه الامور (جلد ۱ - ۶۵۳)

خادع اس کو ہزاروں فریب دیتا ہے۔

ترمذی اور ابوداؤد میں ہے افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جابر" سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمۂ حق ہے جو شاہان جور و ظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے۔

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ ان مجاہدین کاملین اور اصحاب عزیمت عمل کا ہے جن کی زندگی سرتاسر جہاد فی سبیل اللہ اور جن کا وجود یکسر خدمت خلق و شیفتگی صدق، و عشق دعوت ہے، جو اس عمل مقدس کے لیے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے بلکہ ہر صبح جو ان پر آتی ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے اور ہر شام کی تاریکی جو ان پر پھیلتی ہے وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے ان کی زندگی بھر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلت عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے۔ دل، زبان، اعضاء و جوارح۔ سو ان کا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے۔ اُن کی زبان ہمیشہ اعلان حق و دعوت الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے۔ اُن کے ہاتھ اور اُن کے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے۔ اس کے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا؟ اور اس کی راہ کا کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا۔ ذالك فضل الله يوتيه

رکھتا ہے۔

بخاری و ابن ماجہ میں ہے حضرت عائشہؓ نے پوچھا "علی النساء جہاد"؟ کیا عورتوں کے لیے بھی جہاد ہے؟ فرمایا: نعم جهاد لا قتال فیہ۔ الحج والعمرۃ" ہاں جہاد ہے۔ مگر اس میں لڑنا نہیں ہے۔ حج اور عمرہ۔ اس حدیث میں اس سعی اور ترک وطن کی محبت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے۔ عورتوں کے لیے جہاد فرمایا اور کہا ایسا جہاد جس میں لڑائی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت "جہاد" باقی رہتی ہے۔

اگر امت کے لیے دفاع و جنگ کا وقت آگیا، یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں۔ جس کی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے۔ جس نے زبان سے دعوت و تبلیغ کی وہ بھی مجاہد ہے۔ جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی تکلیف و محنت اٹھائی، وہ بھی مجاہد ہے۔ البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی کرے تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ اس کا شمار مومنوں کی جگہ منافقوں میں ہوگا۔ جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا، تو وہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا زمین پر گر مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور منافق کہلائے گا۔ جس شخص کی زبان اعلان حق اور دعوت الی الجہاد میں کھل سکتی ہے۔ مگر نہ کھلی اس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی گو شیطان جیل اور نفس

احکام قطعیہ دفاع

غرضکہ "دفاع" اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے جن کی ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سُنے اور از سر تا پا کانپ نہ اُٹھے۔

یا ایہا الذین امنوا، ما لکم اذا	مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم
قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ	سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل
اثاقلتم الی الارض ارضیتم	کھڑے ہو تو تمہارے قدموں میں حرکت
بالحیوٰۃ الدنیا من الاخرۃ	نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہوئے
فما متاع الحیوٰۃ الدنیا	جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت کو چھوڑ
فی الاخرۃ الا قلیل ۔	کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت
	کر لی؟ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو جس

زندگی پر تم بچھے بیٹھے ہو وُہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے۔

الا تنفروا، یعذبکم عذابا	یاد رکھو! اگر تم نے حکم الٰہی سے سرتابی
الیما و یستبدل قوما غیرکم	کی، اور وقت آنے پر بھی راہ حق میں
ولا تضروہ شیئا واللہ علی	کمربستہ نہ ہوئے، تو اللہ نہایت ہی

من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو! انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی؟ اور نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اس کے بغیر انجام پا سکتا ہے؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کی فضیلت واہمیت پر اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں، سب کا حکم شاخوں کا ہوا۔ جڑ یہی عمل قرار پایا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہوسکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم احیا، ثم اقتل" (رواہ البخاری) خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اس کی راہ میں جان دینے کی سعادت ولذت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

رکھتے ہوں، یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم
کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کی یاوری و اعانت کے لیے اسی طرح
اُٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اُٹھتے
اور اپنی جان و مال سے اسی طرح مدد دیں، جس طرح خود اپنے گھر بار
کی حفاظت کے لیے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے
مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے
ہیں اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں، اور جن پر خود ہندوستانی
عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ ان سب میں یہ احکام موجود ہیں۔ اسلامی
دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملے گا جو ان حکموں سے بے خبر ہو۔
اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر
سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے
بلند کر رہی ہے۔ نوعِ انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکیں، اور یہ احکام اپنی
یکساں، غیر مبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر
حکمرانی کر رہے ہیں۔

جہاد کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم "قتال" یعنی لڑائی ہے اور
اس کی بھی دو صورتیں ہیں "ہجوم" اور "دفاع" یعنی افنسو (OFFENSIVE) اور
ڈیفنسو (DEFENSIVE) دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے ــــ
یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے

کل شیء قدیر ۰ — سخت عذاب میں ڈال کر اس کی سزا دے گا، اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کے لیے کھڑا کر دے گا۔ تم چھانٹ دیئے جاؤ گے۔ کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں ہے۔ تم ہی اپنی زندگی و نجات کے لیے اس کے محتاج ہو!

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت! ان کی حکومتوں کے مٹانے اور ان کی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کے لیے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں:

والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض۔	جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں

مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر ڈالتے ہیں:

ان الذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ۔	جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ:

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض	مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم ایک دوسرے کی رفیق اور مددگار ہیں

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض ٹھہرا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصّہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان اُن کے مقابلہ کی کافی قوت نہ

شرعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم ومقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے۔ بحکم "وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ" ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیئے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے جو مسلمان شریک ہوگا، اس کے لیے بڑا اجر ہے، جو شریک نہ ہوگا اس کے لیے کوئی گناہ نہیں! صاحب ہدایہ (جس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوچکا ہے اور ہندوستانی عدالتوں میں محمڈن لا کی بنیادی کتاب ہے) لکھتے ہیں۔

الجہاد فرض علی الکفایۃ اذا قام فریق من الناس سقط عن الباقین۔ فان لم یقم بہ احد، أثم جمیع الناس بترکہ لان الوجوب علی الکل۔

(کتاب السیر)

جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی کوئی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی تو باقی مسلمانوں کے لیے واجب نہ رہا لیکن اگر کوئی گروہ بھی اس کے لیے نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے، کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے۔

لیکن جماعت سے کیا مقصود ہے! تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت یا ہر ہر ملک اور اقلیم کی جماعت؟ اس کی تشریح سعدی چلپی حاشیہ عنایہ میں کرتے ہیں۔

اقول لا ینبغی ان یفہم منہ ان

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے

ضروری ہوا کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔
اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام
کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہوں گے۔

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں "کفایہ" اور "عین"
یہ وہی اعمالِ انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جس کو "جماعتی فرائض" اور "شخصی
فرائض" کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "فرض کفایہ" سے مقصود وہ
احکام ہیں جو بہ حیثیتِ جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں، نہ کہ بہ حیثیت
فرد و انفراد۔ یعنی اپنے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد
کر دیئے گئے ہیں کہ ان کا انتظام کر دیں۔ پس انتظام ہو جانا چاہیئے۔ یہ
ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے
ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں پر سے اس وقت ساقط
ہو گیا۔ جیسے تجہیز و تکفین اموات اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کے لیے
عزیمت اسی میں ہو گی کہ ادائے فرض کفایہ میں بھی شخصاً حصہ لے۔

فرض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں بلکہ جماعت سے
ہے۔ پس ہر مسلمان جماعت اور آبادی کو اس کا انتظام کر دینا چاہیئے۔
جب انتظام ہو گیا تو اس آبادی کے بقیہ افراد پر اس کا وجوب باقی رہے گا۔

دوسری قسم "اعیان" کی ہے۔ یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت
پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا
بری الذمہ نہیں ہو جا سکتا۔ جیسے پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج،

کو انجام دیتے رہیں۔ بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیئے۔ جو حصول مقصد جہاد کے لیے کافی ہو۔ پس ایک ملک میں سلسلۂ جہاد کے بقا سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ان پر بدستور اس کا وجوب باقی رہے گا اور بصورت ترک وہاں کے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔ گذشتہ پانچ صدیوں سے مسلمانانِ عالم نے اس فرض شرعی کو فراموش کر دیا ہے اور صرف کسی ایک حصّے کے مسلمانوں ہی کے ذمہ اس کو چھوڑ کر خود فارغ البال ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعدائے حق کو صدیوں کی صدیاں عروج و ظہور کے لیے مل گئیں، اور مسلمانوں کے لیے تمام کرۂ ارضی میں کوئی ایک گوشہ بھی امن و سکون کا باقی نہ رہا۔

وما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون ٥

اور فتح الباری میں ہے۔ ھو فرض کفایۃ علی المشھود الا ان تدعوا الحاجۃ الیہ۔ اس کے بعد کہا "وان جنس جھاد الکفار متعین علی کل مسلم، اما بیدہ، واما بلسانہ واما بمالہ واما بقلبہ" (جلد ۶: ۲۸) یعنی جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے۔ باقی رہا نفس جہاد تو وہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ کسی کے لیے ہاتھ سے، کسی کے لیے مال سے، کسی کے لیے دل سے۔ یعنی جس وقت ایک گروہ ہاتھ اور تلوار سے مصروف جہاد ہوگا تو بقیہ مسلمانوں پر دل اور زبان سے ان کے لیے سعی و اعانت فرض ہوگی اور مال و دولت والوں کا فرض ہوگا کہ مال سے مدد کریں۔

الوجوب على جميع اهل الارض كافة حتى يسقط عن اهل الهند بقيام اهل الروم اذ لا يندفع بقيامهم الشر عن الهنود المسلمين۔ وان قوله تعالى قاتلوا الذين يلونكم من الكفار يدل على ان الوجوب على اهل كل قطر يقربون الكفار۔

(مجموعہ فتح القدیر۔ ۴ :۔ ۲۸)

کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں پر سے بھی ساقط ہو گیا۔ مثلاً اگر رُوم کے تُرکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا کیونکہ مقصود قیام جہاد سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر سے دشمنوں کے حملوں اور شر کو دُور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانان روم کے جہاد کرنے سے مسلمانانِ ہند محفوظ نہیں ہو سکتے۔ وہ تو جبھی ہوں گے جب خود اپنے ملک میں اس کا انتظام کریں۔ پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی تو وہاں کے بقیہ مسلمانوں پر سے ساقط ہو جائے گا لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہے گی۔ قرآن میں ہے قاتلوا الذین یلونکم من الکفار۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں قتال واجب ہے۔ انتہار

اس سے واضح ہو گیا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانانِ عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ملک کے مسلمانوں سے ہے اور فرض الکفایہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ مسلمان اس

اور الانفروا کا مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔

ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

هذا اذا لم يكن النفير عاماً فاذا كان النفير عاماً بان هجموا على بلدة من بلاد المسلمين فيصير من فروض الأعيان سواء كان المستنفر عدلاً او فاسقاً (فتح القدير)	فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو لیکن اگر مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے گا۔ خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق۔

اور عنایہ میں ہے:

ثم الجهاد يصير فرض عين عند النفير العام على من يقرب من العدو وهو يقدر عليه۔ (مجموعہ فتح القدير)	اور اگر نفیر عام کی حالت ہو، تو پھر جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض عین ہو جائیگا جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قابو رکھتے ہوں۔

اسی طرح سراجیہ، در المختار، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے۔

اذا جاء النفير انما يصير فرض عين على من يقرب من العدو

اور الجهاد فرض كفاية اذا لم يكن النفير عاماً، فاذا اقام

اسی طرح اثمار میں ہے۔ ھو فرض کفایۃ اذا قام بہ من یکفی سقط وجوبہ عن غیرھم" ابن ادریس اس کی شرح میں لکھتے ہیں: و معنی الکفایۃ فی الجھاد ان ینھض الیہ قوم یکفون فی جھادھم اما ان یکونوا جندا لھم دارین او یکونوا اعدوا انفسھم لہ تبرعاً و تکون فی الثغور من یدفع العدو عنھا و یبعث فی کل سنۃ جیشاً یغیر علی العدو فی بلادھم" (جلد ا۔ ۲۵۱)

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہو گی۔ دوسری قسم "دفاع" ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کا قصد کرے تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کرکے روکنا اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کی غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح کے قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے، بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔ اسی ہدایہ میں ہے:

الا ان یکون النفیر عاما فحینئذ یصیر من فروض الاعیان

نفیر نفر سے ہے "نفر" کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو "نفیر" کا اطلاق ہوا۔ قرآن میں ہے: انفروا خفافا و ثقالا

د الزوج۔ (کتاب السیر) | پہلے یہ صورت نہ تھی۔ اس وقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہو سکتا تھا۔ پس ضرورت نہ تھی کہ شوہر اور آقا کے حقوق پامال کیے جائیں۔

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اس لیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں اور انگریزی میں محمڈن لا پر جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں سب میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ پس بآسانی دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے شرعی احکام یہی ہیں یا نہیں؟ ورنہ تمام کتب تفسیر وحدیث میں بھی یہ احکام موجود ہیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے "وجوب النفیر" یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آجائے تو قتال کے لیے سب کا اٹھ کھڑا ہونا واجب ہے۔ پھر آیۃ "انفروا خفافا وثقالا" اور "ما لکم اذا قیل لکم انفروا" سے وجوب پر استدلال کیا ہے اس کے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے لاھجرۃ بعد الفتح ولکن جہاد ونیتہ واذا استنفرتم فاستنفروا۔ یعنی وہ جو اوائل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی تو فتح مکہ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے۔ تو جب جمع ہونے کے لیے پکارے جاؤ جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے "الا ان تدعو الحاجۃ الیہ کان یدھم

به البعض، يسقط عن الباقين، فاذا صار النفير عاما فحينئذ يصير من فروض الاعيان"اھ

حملہ وہجوم کے دائمی جہاد میں (جب قتال فرض کفایہ ہوتا ہے) بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً عورتیں اور نوکر، عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کے لیے آقا کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آگئی ہو تو اس کی فرضیت ایسی ہمہ گیر اور بالا تر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ، کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو۔ غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول جہاد ہو جاتے۔ ہدایہ میں ہے :۔

فان هجم العدو على البلد وجب على جميع الناس الدفع تخرج المرأة بغير اذن زوجها والعبد بغير اذن المولى لانه صار فرض عين، وملك اليمين ورق النكاح لا يظهر فى حق فروض الاعيان كما فى الصلوة والصوم بخلاف ما قبل النفير لان بغيرهما مقنع فلا ضرورة الى ابطال حق المولى

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہو گیا بیوی بلا شوہر کی اجازت کے اور غلام بلا آقا کی اذن کے دفاع میں حصہ لے اس لیے کہ اب جہاد فرض عین ہو گیا اور جو فرائض ایسے ہیں ان پر مالکیت اور زوجیت کے حقوق موثر نہیں ہو سکتے جیسے نماز اور روزہ اگر نماز کا وقت آگیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہو گئی ہے شوہر کی اذن پر موقوف نہیں البتہ نفیر سے

تو جہاد کرد مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو مقتضائے نفیر ہے
پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں
میں لڑائی شروع ہو گئی تو جہاد فرض ہو گیا۔ اور جب دشمنوں کی طاقت ان
ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور ان کی شکست کا خوف
ہوا، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہو گیا۔ خواہ کوئی
پکارے یا نہ پکارے پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و
بدحالی ہے۔ ان کا فرض ہوگا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام
فرائض کا ہے۔ نماز کا جب وقت آجائے تو خواہ مؤذن کی صدائے
"حی علی الصلوٰۃ" سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آجانا وجوب کے لیے
کافی ہوتا ہے :-

ترتیبِ وجوبِ دفاع

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہو گیا تو اب معلوم ہونا چاہیئے کہ
اس فرض کی انجام دہی کے لیے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی
ہے۔ عقل و حکمت کی بنا پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہو سکتی
تھی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت

العدو ویتعین علی من عینہ الامام" (جلد۶ : ۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے۔" اذا کان الکفار مستقرین ببلادھم فالجہاد فرض کفایۃ ان اقام بہ بعضھم سقط الحرج عن الباقین واذا قصدوا بلادنا واستنفروا الامام المسلمین، وجب علی الاعیان" یعنی اگر کفار اپنے اپنے ملکوں میں ہیں۔ مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں۔ تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے۔ لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے تو پھر فرض عین ہو جائے گا۔

چونکہ جا بجا "نفیر" کا لفظ آیا ہے، اس لیے یہ بات صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے؟ یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آ جائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا، نفیر عام کی حالت پیدا نہ ہو گی؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دے دیا ہے۔

"نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود۔ استنفار را چوں منقح کنیم حاصل شود حالتے کہ مقتضائے استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا، و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین و کافرین، و عدم کفایہ ازاں مسلمانان. و آنچہ بداں ماند (مسوی جلد۲ : ۱۲۹)

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضرور نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ

ایسا فسق و عدوان، ایسا نفاق جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے اگر قیامت کا آنا حق ہے، اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے، تو مسلمانانِ عالم کے پاس اُس وقت کیا جواب ہوگا۔ جب قیامت کے دِن پوچھا جائے گا کہ تم کروڑوں کی تعداد میں زندہ و سلامت موجود تھے۔ تمہارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی، تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا، تمہارے کان بہرے نہ تھے، نہ ہاتھ کٹے ہوئے اور پاؤں لنگڑے پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں۔ وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو گئیں۔ پر نہ تو تمہارے بازوؤں میں جنبش ہوئی، نہ تمہارے قدموں میں حرکت ہوئی، نہ تمہاری آنکھوں نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بخشا، اور نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل و حرص پرستی کے قفل ٹوٹے؟ تم نے چین اور آرام کے بستروں پر لیٹ لیٹ کر بربادیٔ ملت اور پامالیٔ اسلام کا یہ خونیں تماشا دیکھا، اور اُس بے درد تماشائی کی طرح بے حس و حرکت تکتے رہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا ہو۔

ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاخرۃ؟ فما الحیٰوۃ الدنیا الا قلیل

فتح القدیر میں ہے۔

یجب علی جمیع اھل تلک البلدۃ النفر، وکذا من یقرب | اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اُس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اُٹھ

اور آبادی کا قصد کیا، تو اس شہر کے تمام مسلمانوں پر بہ مجرد قصد اعداء دفاع فرض عین ہو گیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان، تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کے لیے کافی قوت نہیں رکھتے۔ دشمن بہت زیادہ قوی ہے۔ یاد رکھتے ہیں اور غفلت و تساہل کرنے لگے ہیں تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائے گا بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ۔

مگر صورت اس کی یوں ہو گی کہ پہلے ان مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر واجب ہو گا، پھر ان سے قریب تر پر۔ پھر ان سے قریب تر پر۔ حتیٰ کہ مشرق و مغرب، جنوب و شمال، تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہو جائے گی۔

اس وقت سارے فرائض، سارے وظائف، سارے کام ملتوی کر دینے چاہئیں۔ بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت وجہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے اور قیام دفاع کے لیے شرعاً جن جن وسائل و انتظامات کی ضرورت ہے۔ سب کو مل جل کر ان کا انصرام کرنا چاہیئے۔ اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام و پیشوا نہیں ہے جو نظم و قیام اپنے ہاتھ میں لے تو سب کا فرض ہو گا کہ پہلے امام و امیر کا انتظام کریں۔ پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو ان کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر و سعی کام میں لائیں اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ سب مبتلائے معصیت و فسق ہوں گے ایسی معصیت

من ورائہم فلا یکون فرضا علیہم الا اذا احتیج الیہم امابعجز القریب، واما لتاسکل، فحینئذ یفرض علی من یلیہم" الخ

اورشرح موطا میں ہے فان لم تقع الکفایۃ بمن نزل بہم یجب علی من بعد منہم من المسلمین عونہم" (جلد ۲ - ۱۲۹)

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں۔ جن میں وجوب دفاع کے لیے یکے بعد دیگرے اس ترتیب اور "الاقرب فالاقرب" کی ضرورت باقی رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانان عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفۂ وقت تمام مسلمانانِ عالم سے طالب اعانت ہو، یا اس کی بے لبی و بے چارگی کی حالت ایسی ہو جاتے کہ بلا تمام مسلمانانِ عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی و فتح ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے مین مرکزی مقام یعنی جزیرۃ عرب پر غیر مسلم حملہ آور ہوں۔ جن کو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔ تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

منهم ان لم یکن باھلھا کفایۃ وکذا من یقرب منھم ان لم یکن باھلھا کفایۃ وکذا من یقرب ممن یقرب ان لم یکن بمن یقرب کفایۃ او تکاسلوا اوعصوا وھکذا الی ان یجب علی جمیع اھل الاسلام شرقا وغربا (جلد ۴ صفحہ ۸۲۰)

کھڑا ہونا فرض عین ہو جائے گا اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کے لیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں تو جو مسلمان ان سے قریب ہوں گے ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔ اور اگر وہ بھی کافی نہیں یا انہوں نے سستی کی یا دانستہ انکار کیا، تو پھر ان تمام لوگوں پر جو ان سے قریب ہو یہ فرض عائد ہوگا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے اس کا وجوب منتقل ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب میں، دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض ہو جائے گا۔ انتہار

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ وحدیث میں ہے۔ عبارتوں کے نقل در ترجمہ میں طول ہوگا۔ ردالمختار وغیرہ شروح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے:

فاما من وراءھم ببعد من العدو، فھو فرض کفایۃ علیھم حتی یسعھم ترکہ، اذا لم یحتج الیھم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ، اولم یعجزوا عنھا لکنھم تکاسلوا، فانہ یفترض علی من یلیہ فرض کالصلوٰۃ والصوم لایسعھم ترکہ، وثم الی ان یفترض علی جمیع اھل الاسلام شرقا وغربا۔ اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے" ثم الجھاد یصیر فرض عین عند النفیر العام علی من یقرب من العدو وھو یقدر علیہ، واما

نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمین حجاز کو منتخب کیا۔ یہی نافِ زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت وسعادت کے لیے مرکزی سرچشمہ اور رُوحانی درسگاہ قرار پائی۔ اور چونکہ سرزمین حجاز جزیرۂ عرب میں واقع تھی، وہی اسلام کا اولین موطن، وہی اس کا سب سے پہلا سرچشمہ تھا اس لیے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا۔ لہٰذا یہ تمام سرزمین بھی کہ حجاز کی "وادی غیر ذی زرع" کو گھیرے ہوئے ہے۔ اسی حکم میں داخل ہوگئی ذالك تقدیر العزیز العلیم۔

"مرکزِ ارضی" سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین المللی دعوت تھی وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرۂ ارضی میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا، جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کے لیے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا۔ سارے بکھرے ہُوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمٹ جاتے۔ تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملتی۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی، ہر ستارہ اس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر دُوری اس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اس سے مواصلت ملتی۔ ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔

وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک وسطی درسگاہ

مرکزِ ارضی

کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک اس کا کوئی ارضی مرکز نہ ہو کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی، جب تک اس کی ایک قائم و جاری درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا جاری رہ سکتا، جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اس کا لگاؤ نہ ہو۔

نظامِ شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکزِ شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا معلق کارخانہ سنبھال رکھا ہے! اللہ الذی رفع السموٰت بغیر عمد ترونہا ثم استوی علی العرش، وسخر الشمس والقمر: کل یجری لاجل مستمی

یہی قانونِ الٰہی ہے جس پر اس کی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے اُمّت کے بقا اور حق و ہدایت کے قیام کے لیے ہر طرح کے مرکز قرار دیئے، ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کے لیے قرار دے دیا جاتا۔

ان بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر، جن کی تشریح کا یہ موقع

جس طرح اپنے آشیانوں کی طرف اُڑتے ہیں، اور پرداوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دوڑے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اس طرف دوڑتے اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اس تک پہنچتی ہیں، ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رہتیں۔
دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطرب روحوں کے لیے اس کے آغوشِ گرم میں آرام و سکون کی ٹھنڈک ہوتی۔ گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے اور محرومی و نامرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل چیختے اور تڑپتے ہوئے اس کی جانب دوڑتے، تو اس کی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار ہو جاتی، اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبّت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں، اور اس کی مقدس فضا میں رحمت کے فرشتے غول در غول اُتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت و قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔
شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی جڑ اگر سلامت ہے تو شاخوں اور پتیوں کے مرجھانے سے باغ اُجڑ نہیں جا سکتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں گی، تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے، تو اس کے بکھرے ہُوئے ٹکڑوں کی بربادی سے قوم نہیں مٹ سکتی۔ سارے ٹکڑے مٹ جائیں، مگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی شاخیں پھوٹیں گی اور نئی نئی زندگیاں اُبھریں گی۔

کا کام دیتا۔ وہی تمام کرۂ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کے لئے نقطۂ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا ٹھنڈی پڑجاتی پر اُس کا تنور کبھی نہ بجھتا۔ ساری دنیا تاریک ہوجاتی، مگر اس کی روشنی کبھی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا اولاد آدم کے باہمی جنگ وجدال اور فتنہ وفساد سے خون ریزی کی دوزخ بن جاتی پھر بھی ایک گوشۂ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن ورحمت کا بہشت ہوتا اور انسانی فتنہ و فساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑسکتی۔

اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہوتا۔ اس کا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہوجاتا۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال وقدوسیت کا جلوہ گاہ ہوتا خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم وفساد کی نجاست سے آلودہ کرسکتا، پر اس کی فضاء مقدس ہمیشہ پاک ومحفوظ رہتی اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی سچی پادشاہت کا تخت عظمت وجلال بچھ جاتا، اور اس کا ظل عاطفت تمام بندگان حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا۔

دنیا پر کفر وشرک جماؤ اور اٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا، مگر سچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا، جہاں خدا اور اس کی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی، نہ کسی صدا کی گونج اُٹھ سکتی۔

وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کے لیے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا کٹ کٹ کر قومیں وہاں جڑتیں، اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹتیں۔ پرند

امت، تمام کرۂ ارضی، اور تمام اقوام عالم کو، اس نقطۂ مرکز سے دائمی پیوستگی بخش دی۔

وأذن فی الناس بالحج یاتوك رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔

اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ پھر ایسا ہو گا کہ ساری دنیا کو یہ گوشۂ برکت کھینچ بلائے گا۔ لوگوں کے پیادے اور سوار قافلے دُور دُور سے یہاں پہنچیں گے

احکامِ شرعیّہ

اس مرکز کے قیام و بقا کے لیے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ دائمی طور پر اس کو صرف اسلام کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی۔ اُمّت کے لیے اس مرکزیت کے مطلوبہ مقاصد و مصالح حاصل نہ ہوتے۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا: انما المشرکون نجس، فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھٰذا مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے لیے مخصوص ہیں۔ اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں، بلکہ کسی حال

پس جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کے لیے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا، اسی طرح ان کی ارضی وسعت و انتشار کے لیے عبادت کدۂ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ، اس کی سرزمین حجاز، اور اس کا ملک جزیرۂ عرب دائمی مرکز قرار پایا۔ یہی معنی ان آیاتِ کریمہ کے ہیں کہ:

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس ۔	اللہ نے کعبہ کو اس کا محترم گھر ہے انسانوں کے بقا و قیام کا باعث ٹھہرایا۔
واذجعلنا البیت مثابۃ للناس و امنا	اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانۂ کعبہ کو انسانوں کے لیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا۔
اور ومن دخلہ کان امنا	جو اس کے حدود کے اندر پہنچ گیا، اس کے لیے کسی طرح کا خوف اور ڈر نہیں

اور علت یہی تھی تحویل قبلہ کی۔ نہ وہ لوگوں نے سمجھی!

وحیث ماکنتم فولوا وجوھکم شطرہ	اور تم کہیں بھی ہو، لیکن چاہیے کہ اپنا رُخ اسی کی جانب رکھو!

کیونکہ جب یہی مقام ارضی مرکز قرار پایا، تو تمام افراد قوم کے لیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، رُخ اُن کا اسی طرف رہے اور دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کی طرف متوجہ ہوتے رہیں اور یاد رہے کہ منجملہ بے شمار مصالح و حکم کے، ایک بڑی مصلحت فریضۂ حج میں یہ بھی ہے کہ ساری

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرۃ عرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے۔ خیبر میں انہی کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔

مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی آخری جماعت جو مدینہ سے خارج کی گئی، بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا۔ امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے "ان یھود بنی النضیر حاربوا رسول اللہ صلعم فاجلی بنی النضیر واقر قریظۃ ومن علیھم حتی حاربت قریظۃ فقتل رجالھم وقسم اولادھم و نسائھم بین المسلمین الا بعضھم لحقوا برسول اللہ فامنھم واسلموا، واجلی یھود المدینۃ کلھم بنی قینقاع وھم قوم عبداللہ بن سلام و یھود بنی حارثۃ، وکل یھودی کان بالمدینۃ"

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ بروایت حضرت ابو ہریرہؓ آپ صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا "یامعشر الیھود اسلموا تسلموا" اسلام قبول کرو۔ نجات پاؤ گے۔ پھر فرمایا اعلموا ان الارض للہ ورسولہ وانی ارید ان اجلیکم من ھذہ الارض فمن وجد منکم بمالہ شیئا فلیبعہ، والا فاعلموا ان الارض للہ ورسولہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کر دوں۔ پس اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کر دو۔ ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت صرف

میں داخل نہ ہوں۔ جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطۂ کعبہ ہی نہیں ہے بلکہ تمام سرزمین حرم ہے اور دلائل و مباحث اس کے اپنے مقام پر درج ہیں۔

اور اسی طرح احادیث صحیحہ و کثیرہ سے جو حضرت علی، سعد بن وقاص، انس، جابر، ابوہریرہ، عبداللہ بن زید، رافع بن خدیج، سہل بن حنیف وغیرہم اجلۂ صحابہ سے مروی ہیں۔ ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے، اور عیر و ثور اس کے حدود ہیں۔ "المدینۃ حرام ما بین عیر الی ثور" (اخرجہ الشیخان) اور روایت سعد کہ "انی احرم ما بین لابتی المدینۃ ان یقطع عضاھا او یقتل صیدھا" رواہ مسلم۔ اور روایت انس متفق علیہ "اللھم ان ابراھیم حرم مکۃ وانی احرم ما بین لابتیھا" خدایا! ابراہیم نے مکہ کو حرم ٹھہرایا اور میں مدینہ کو حرم ٹھہراتا ہوں[1]۔

یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے، باقی رہا اس کا گرد و پیش یعنی جزیرۂ عرب، تو گو اس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی، تاہم اس کا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا، تاکہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اس کا مولد و منشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ رہے۔

---

[1] زیادہ مفصل بحث رسالہ "جامع الشواہد" میں لکھ چکا ہوں اس رسالہ کا اصل موضوع مسئلہ خلافت ہے، یہ ٹکڑا ضمناً آ گیا ہے پس اشارات پر اکتفا کیا گیا۔

ان قال بترك بجزيرة العرب دينان" رواه احمد یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں صرف اسلام ہی کے لیے مخصوص ہو جاتے۔ امام مالک نے موطا میں عمر بن عبدالعزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کیے ہیں اور مصمودی وغیرہ ہم نے باب باندھا ہے "اخراج الیهود والنصاری من جزیرة العرب" عمر ابن عبدالعزیز کی روایت میں ہے" کان من آخر ما تکلم به رسول الله صلعم انه قال قاتل الله الیهود والنصاری، اتخذوا قبور انبیاءهم مساجد۔ لا یبقیان دینان بارض العرب اور ابن شہاب کا لفظ ہے" لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب"

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے آخر تکلم قاتل الله الیهود والنصاری جو نقل کیا ہے تو حضرت عائشہ سے صحیحین وغیرہا میں بطریق رفع ثابت ہے۔

حافظ نواوی نے گو امام بخاری کا اتباع کیا اور "اجلاء الیهود" کا باب استدلالاً کافی سمجھا۔ لیکن حافظ منذری نے تلخیص مسلم میں "اخراج الیهود والنصاری من جزیرة العرب" کا الگ باب باندھ کر جزیرۂ عرب والی روایتیں روایات اجلاء یہود سے الگ کردی ہیں۔ یہ وصیت نبوی علاوہ طرق بالا کے مسند امام احمد، مسند حمیدی، سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مروی ہے، اور سب کا مضمون متحد اور باہمدگر اجمال و تبیین اور اعتقاد و تقویت کا حکم رکھتا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ہی کے لیے ہے۔ اسلام کے لیے مخصوص کر دیا جائے جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے ہیں۔ خارج کر دیئے جائیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے "اخراج الیہود من جزیرۃ العرب" اس میں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں، جو اوپر گزر چکی۔ دوسری روایت حضرت ابن عباس کی ہے۔ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ تھی "اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب" حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "اقتصر علی ذکر الیہود لانھم یوحدون اللہ تعالیٰ الا القلیل ومع ذالک امر باخراجھم فیکون اخراج غیرھم من الکفار بطریق اولی (فتح الباری، ۶: ۱۴۹) یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا۔ اس میں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں۔ ان کو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا وجوب بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گیا۔ پس حاجت تصریح نہیں۔

حضرت عمر کی روایت میں "یہود و النصاری" کا لفظ ہے۔ "لاخرجن الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب حتی لا ادع الا مسلماً" (رواہ مسلم واحمد والترمذی وصححہ) ابو عبیدہ بن جراح سے امام احمد نے روایت کیا ہے: "اخر ما تکلم بہ رسول اللہ صلعم اخرجوا یہود اھل الحجاز واھل نجران من جزیرۃ العرب" حضرت عائشہ کی روایت میں اس کی علت بھی واضح کر دی ہے۔ "اخر ما عہد رسول اللہ صلعم

پہنچا دیا۔ پس حضرت عمر نے اس وصیت کی تحقیق کی، اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا۔ سب نے اتفاق کیا اور یہود خیبر و فدک سے خارج کر دیئے گئے۔ اسی طرح نجران سے بھی عیسائیوں کا اخراج عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے "ما زال عمر حتی وجد الثبت عن رسول اللہ انہ قال لا یجتمع بجزیرۃ العرب دینان، فقال من کان لہ من اہل الکتاب عہد فلیات بہ، انفذ لہ، والا فانی مجلیکم، فاجلاھم

(اخرجہ ابن ابی شیبۃ)

امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب "اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک" میں درج کیا ہے۔ اور ترجمۂ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے عارضی مشروط تھا۔ بالاستقلال نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں۔ حضرت عمر کے اجلاء کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے۔

پس صاحب شریعت کے قول و عمل، اُن کے آخری لمحات حیات کی وصیت، حضرت عمر کی محض تصدیق، تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے جزیرۂ عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ الّا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفۂ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہاں غیر مسلموں کا قیام اور دو دینوں کا اجتماع شریعت

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے۔ جیسے تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے وُہ ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے۔ جیسے فتح ممالک اور قوانین سیاسیہ و ملکیہ۔

سنت الٰہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں، اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر ان کی تکمیل کا اعلان کر کے۔ لیکن دوسری قسم کے لیے ایسا ہونا ضروری نہیں یہ احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے نفاذ و وقوع کے لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد تدریج تکمیل و تنفید پاتے ہیں پس ان کی نسبت یا تو بطریق پیشین گوئی کے خبر دے دی جاتی ہے۔ یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ پس ضرور نہ تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود مدینہ کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا۔ یہود خیبر سے ابتداء ہی میں یہ شرط کر لی تھی کہ جب ضرورت ہو گی، اس سرزمین سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔ پھر تکمیل کے لیے اپنے جانشینوں کو وصیت فرما دی چنانچہ حضرت عمر کے زمانے میں تکمیل کا وقت آ گیا اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کر کے خود ہی اس کا موقع

فتح الباری وغیرہ میں ہے "قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب، لان بحر فارس وبحر حبشۃ والفرات والدجلۃ احاطت بہا"
اور اصمعی کا قول ہے: لاحاطۃ البحار بہا، یعنی بحر الھند والقلزم و بحر فارس وبحر الحبشۃ ودجلۃ (ایضاً)

نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے "سمیت جزیرۃ لان بحر الفارس وبحر سودان احاط بجانبیہا، واحاط بالجانب الشمال دجلہ والفرات۔

یہی قول ارباب لغت کا بھی ہے۔ قاموس میں ہے "جزیرۃ العرب ما احاطہ بحر الھند والشام ثم دجلہ والفرات پروفیسر لپطرس بستانی نے بھی (جو زمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے۔ اور جس نے عربی میں انسائیکلوپیڈیا لکھنی شروع کی تھی) محیط المحیط میں یہی تعریف کی ہے۔

حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرہ عرب وہ سرزمین ہے جس کے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ وفرات۔

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں دیا ہے اس سے زیادہ جامع ومعتبر کتاب عربی میں جغرافیہ وتقویم بلدان کی کوئی نہیں:

انما سمیت بلاد العرب جزیرۃ لاحاطۃ الانہار والبحار وذالک ان الفرات اقبل من بلاد الروم، فظھر بناحیۃ قنسرین، ثم انحط

کو منظور نہیں تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی و بالا دستی کو جائز رکھنا کب مسلمانوں کے لیے جائز ہو سکتا ہے ؟

جزیرۂ عرب کی تحدید

باقی رہا یہ مسئلہ جزیرۂ عرب سے مقصود کیا ہے ؟ تو یہ بالکل صاف و واضح ہے اس کے لیے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ نص حدیث میں "جزیرۂ عرب" کا لفظ وارد ہے اور عقلاً و اصولاً معلوم ہے کہ جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو، کسی لفظ کے منطوق اور عام و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا اور نہ بلا مخصص کے قیاساً تخصیص جائز۔ شارع نے "جزیرہ" کا لفظ کہا، اور دنیا میں اس وقت سے لے کر اب تک جزیرۂ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان رہا ہے۔ پس جو مطلب اس کا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے، وہی سمجھا جائے گا۔

تمام مؤرخین اور جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں کہ عرب کو "جزیرہ" اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک جانب دریا کے پانی سے محصور ہے۔ یعنی تین طرف بحر ہند خلیج فارس، بحر احمر و قلزم واقع ہیں۔ ایک جانب دریائے دجلہ و فرات۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ جزیرۂ عرب کی حُدود کیا ہیں؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کر کے دیکھو اوپر شمال ہے۔ دائیں مشرق، بائیں مغرب، شمال میں دریائے فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا ہوا دجلہ میں مل جاتا ہے۔ پھر دونوں مل کر خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ فرات کے پیچھے دجلہ کا خط ہے، اسی پر بغداد واقع ہے۔ خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف وحسا۔ پھر یہ خلیج تنگ نائے ہرمز سے نکل کر مسقط وعمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اس کے بعد ہی بحرِ عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضرموت کا ساحل دیکھو گے پھر عدن آ گیا۔ اور باب المندب سے جونہی آگے بڑھے بحر احمر شروع ہو گیا۔ چونکہ اس کا مغربی ساحل افریقہ وحبش سے متصل ہے، اس لیے قدیم جغرافیہ میں اس کو بحرِ حبش بھی کہتے ہیں۔ بحر احمر کے کنارے پہلے یمن ملے گا پھر جدہ اس کے بعد ساحل حجاز حتّٰی کہ سمندر کی شاخ تپلی ہو کر طور سینا تک منتہی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی خلیج عقبیٰ کی شاخ نمودار ہوئی۔ اب مصر کی سرزمین شروع ہو گئی۔ نہر سویز کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑا تھا جس نے بحر احمر کو بحر متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اس لیے صاحب معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا جس کو اسی درمیانی تختہ خشک کے بائیں جانب دیکھ رہے ہو۔ دو قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر میں گرتا ہے۔ پس اگرچہ اس زمانے میں یہ ٹکڑا خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خطِ آبی موجود تھا

على اطراف الجزيرة وسواد العراق، حتى وقع بالبحر في ناحية البصرة والابلہ، وامتد الى عبادان، واخذ البحر في ذالك الموضع مغرباً منعطفاً ببلاد العرب" الخ

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اس لیے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا ہے۔ صورت اس کی یوں ہے کہ دریائے فرات بلادِ روم سے شروع ہوا، اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا۔ وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا، اور قطیف وہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شحر سے گزر گیا پھر حضرموت اور عدن ہوتا ہوا پچھم کی جانب یمن کے ساحلوں سے جا ٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا۔ مکہ وحجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طور اور خلیج ایلہ پر جاکر سمندر کی شاخ ختم ہوگئی۔ پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلزم نمودار ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ بلادِ فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین شام و ساحل اردن تک بیروت پر پہنچتا ہے اور آخر میں پھر قنسرین تک منتہی ہوکر وہ جگہ آجاتی ہے۔ جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ بحر احمر اور قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں کیونکہ سوڈان سے دریائے نیل وہاں آپہنچتا ہے اور قلزم میں گرا ہے یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین عبارت ہے، اور یہی عرب اقوام کا مولد ومنشاء ہے (انتہا لمحضار، ۳: ۱۰۰)

یہی قاموس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلبی سے مروی ہے۔ رفاعہ بک طہطاوی نے قدیم وجدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں "تعریفات النافعہ لمزید الجغرافیہ" لکھی۔ اس میں یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہو گیا کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں دہنی جانب دجلہ ہے، اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام۔ آج کل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے یہی حدود بتلائے جاتے ہیں۔ پچھم میں بحر احمر، دکھن میں بحر ہند، پورب میں خلیج فارس اور اُتر میں ملک شام۔

اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ای انہا اسفل ارض العرب" (جلد ۶ : ۱۳۳) یعنی عراق اس لیے نام ہُوا کہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصّہ ہے۔ اس سے بھی ثابت ہُوا کہ عراق عرب میں داخل ہے۔ البتہ عراق کا وہ حصّہ جو دجلہ کے پار واقع ہے۔ اس میں داخل نہ ہو گا۔

اس کے بعد بحر متوسط ہے جس کے ابتدائی حصّہ کو قدیم جغرافیہ نویس
بحر مصر و شام سے موسوم کرتے ہیں ۔ اسی پر بیروت واقع ہے اور ساحل
سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا جہاں سے دریائے
فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بڑھا تھا۔

پس یہ ایک مثلث نما ٹکڑا ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع
ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے
یعنی سرحد شام۔ یہی مثلث ٹکڑا جزیرۃ عرب ہے۔ قدیم و جدید جغرافیہ نگار
دونوں اس پر متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے جزیرۃ اور "جزیرہ نما" ہونے میں سب سے
زیادہ اہم وجود دریائے دجلہ و فرات کا ہے۔ کیونکہ اگر یہ عرب
کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے، تو پھر اس کی ایسی صورت ہی
باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے۔ یعنی شمال کی جانب بالکل
خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی،
احاطہ بحر و نہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہو
ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لے کر حدود متعین کیے انہوں نے
بھی صاف کہہ دیا کہ شمالی حد دجلہ ہے۔ نہایہ، معجم البلدان اور فتح الباری
میں اصمعی کا قول منقول ہے "من اقصی عدن ابین الی ریف العراق
طولاً و من جدۃ وساحل البحر الی اطواف الشام عرضاً"۔ کرمانی نے
کہا "ھی ما بین عدن الی ریف العراق طولاً و من جدۃ الی الشام

نبوی اور حج وعمرہ کا ادا کرنا۔ حالانکہ ان تینوں جگہوں کے علاوہ اگر کسی دوسری زیارت گاہ کے سفر کے لیے نذر مانی ہو۔ تو اس کا ادا کرنا باتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اسی بات سے اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام واعتقاد میں کیسا اہم درجہ رکھتی ہے۔؟

یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس کا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے اور دنیا کی حکومت وعزت کے ساتھ یہاں کی بادشاہت بھی ان سے چھین لی گئی۔ پھر مسیحی دور شروع ہوا۔ اس کے بعد مسلمان وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی " ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر، ان الارض یرثھا عبادی الصالحون، ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین۔ وما ارسلناك الا رحمۃ للعلمین۔ (۲۱: ۱۰۵) حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے کہ اس آیت میں "الارض" سے مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے اس میں خبر دی گئی تھی کہ اب وہاں کی بادشاہت مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔ اسی لیے کہا: ان فی ھذا لبلاغا الخ

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سرزمین کی خدمت ووراثت کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ وامانت سمجھا، اور اس کی حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت وفرمانروائی سے بھی زیادہ عزیز ومحبوب سمجھتے رہے۔ یہی اعتقاد دینی تھا۔ جس نے مسیحی جہاد کی ان آٹھ لڑائیوں کو کامیاب

مسجدِ اقصیٰ و ارضِ مقدّس

مقاماتِ مقدسۂ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اس کی سرزمین کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے لیے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جس قدر حرم مکہ اور حرم مدینہ کا۔

اسلام نے صرف تین مقامات کی بہ نیت طاعت و ثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں جس طرح مکہ و مدینہ کا نام آتا ہے اسی طرح بیت المقدس کا بھی۔ بخاری و مسلم کی مشہور روایت ہے: "لاتشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد: المسجد الحرام، ومسجدی ھٰذا والمسجد الاقصیٰ" یعنی بہ نیت زیارت و طاعت سفر کا قصد و اہتمام کرنا نہیں ہے۔ مگر ان تین جگہوں کے لیے مسجد حرام، مدینہ، اور مسجد اقصیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے شرعًا یہی تین مقام سب سے زیادہ مقدّس و محترم ہیں اور انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی زیارت کے لیے نیّت کر کے اپنے وطنوں سے نکلتے ہیں، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ اس کے معاوضہ میں اُن کے لیے بڑا ہی اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمۂ اسلام نے اتفاق کیا کہ اگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کی نذر مانی ہو، تو اس کا ادا کرنا اسی طرح واجب ہوگا جس طرح زیارت مسجد

خاتمۂ سخن

نتائج بحث

گزشتہ مباحث وتفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے "خلیفہ" سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحب حکومت ومملکت ہے۔ جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء ونفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔

(۲) اس کی اطاعت واعانت ہر مسلمان پر فرض ہے اور مثل اطاعت خدا ورسول کے ہے۔ تاوقتیکہ اس سے کفر بواح (صریح) ظاہر نہ ہو۔ جو مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا۔ جس سے مسلمان نے اس کے مقابلے میں لڑائی یا لڑنے والوں کی مدد کی۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں تلوار کھینچی۔ وہ اسلام سے باہر ہو گیا۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلم سمجھتا ہو۔

(۳) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم چکی ہے۔ اور پھر کوئی مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا اور اپنی حکومت کا دعویٰ کیا۔ تو وہ باغی ہے اس

ہونے نہ دیا۔ جن میں تمام یورپ کی طاقت اکٹھی ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹکل طاقت کے عروج کا نہ تھا۔ تنزل و انحطاط کا تھا۔ اور تمام عالم اسلامی مختلف حکومتوں میں منتفرق ہو چکا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہاں کی حکومت خلیفۂ اسلام کے ماتحت رہی ہے اور ہمیشہ خود یورپ نے مسیحی دنیا کے امن و سکون کے لیے اسی بات کو بہتر سمجھا ہے پس اگر آج پھر ازمنہ مظلمہ (ڈارک ایجز) کی تاریخ دہرائی جائے گی اور اسلام کی جگہ اُسے مسیحیت یا یہودیت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائے گی۔ تو مسلمانانِ عالم کے لیے ناممکن ہو گا کہ خاموش رہ سکیں۔ ان کا فرض ہو گا کہ جب گزشتہ کروسیڈ کا ایک حصہ دہرایا گیا ہے تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آجائے وہ مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے۔ ان کا مقدس اوّلین قبلہ ہے۔ اس کی مذہبی وابستگی ان کے ایمان و مذہب کا جزو ہے۔ اگر وہاں یہودیوں کا اقتدار بڑھایا جاتا ہے۔ یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالادستی کے نام سے قائم کیا جاتا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کی آبادیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی شریعت کو چیلنج دینا ہے اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں، یا اس کی اطاعت و حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔

کے فرض عین ہو گی۔

(۷) اگر خلیفۂ اسلام کو دشمنوں کا ایسا طاقتور گروہ گھیرے کہ ان کا مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو، اور بلا تمام مسلمانانِ عالم کی فوری مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ ہو سکے، تو اس صورت میں تمام دُنیا کے مسلمانوں کا یہ ایک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح ممکن ہو، اس کی مدد کریں اور اس کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں۔

(۸) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے۔ یا اس کو خلیفۂ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے، تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا رہا ہے۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اوّلین فرض ہوگا، کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔

(۹) اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے نہ دیں۔

کو قتل کر دینا چاہیئے۔

(۴) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے اور اس وقت از روئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ وامام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت واعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا، اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی۔ جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی، یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔

(۵) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو۔ تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے یا ان کی مدد کرے اگر کرے گا تو بحکم "من حمل علینا السلاح فلیس منا" اور نص قرآنی "من یقتل مؤمنا متعمدا فجزاءہ جہنم خالدا فیہا" وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

(۶) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں یا حملہ کا قصد کریں یا ان کی آزادی وخودمختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے ان کی مدد کرنا، اور حملہ کرنے والوں سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں، اور ان کے مقابلہ کی کافی طاقت ان مسلمانوں اور وہاں کی اسلامی حکومت میں نہ ہو، اس صورت میں جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہ ہوگی۔ مثل نماز روزہ

جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پوری تاریخ میں آج تک کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کی فوجیں بھی میدان جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کر دیا۔

اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشتہر کی گئی، تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے۔ نہ کہ حملہ آورانہ ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے۔ لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے۔ اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسا رکھنا چاہیئے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے جن میں عراق بھی داخل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ آئے گی۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔ خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلاصہ اس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر ۱۹۱۴ء کو اعلان

علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا بلکہ بیک وقت و بہ یک دفعہ تمام مسلمانانِ عالم کا۔

(۱۰) اس صورت میں جو فرض شرعی مسلمانوں پر عائد ہوگا۔ اس میں پہلی چیز "ترک" ہے، دوسری "اختیار"۔ "ترک" سے مقصود یہ ہے کہ تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا پڑیں گے جن میں برٹش گورنمنٹ کی اعانت و موالات ہو۔ "اختیار" سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل اختیار کرنے پڑیں گے جن کے ذریعہ فریضۂ دفاع انجام پا سکے۔

تلک عشرۃ کاملۃ

خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ

جبکہ اسلام کے اٹل اور اپنے پیروؤں کے لیے دائمی احکام کا یہ حال ہے، تو یکایک ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو ایک عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ وسط یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتش گیر مادہ جنگ بھڑک اٹھا "نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ" پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جنگ نے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک ایسی نازک صورت اختیار کرلی

صورت حال مشتبہ ہوگئی۔ نادان و جیلہ جو علماء اس خیال میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان و دولِ متحدہ پر حملہ کیا ہے تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ و ہجوم کی ہے، اور اس لیے اس کی شرکت فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے نہ کہ فرض عین کا۔ پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانِ ہند بھی اس میں حصّہ لیں۔ عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بچاؤ کر رہی ہے اس کا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفۂ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔ ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جاتا ہے، بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی۔

نہایت افسوس اور روسیاہی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا۔ نہ وعدوں اور اعلان پر اعتماد۔ انہوں نے اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی جیسی اس موقع پر کی، اور جس کے نتائج کی پہلی قسط آج ان کے سامنے ہے وما تخفی فی صدورھم اکبر" فما کان اللہ لیظلمھم و لکن کانوا انفسھم یظلمون ۝

تھوڑی دیر کے لیے اس سے قطع نظر کر لو کہ احکام شرع کی بنا پر یہ رائے کہاں تک صحیح تھی؟ صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسا کیا گیا ان کا حال کیا تھا؟

جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا۔ اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اس کی اشاعت کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہر کمشنری ہر ضلع، ہر صدر مقام، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے ان کی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی بھی پڑھ کر سنایا تھا۔ برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان کم ایسا نہیں ملے گا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ دیا گیا ہو۔ بعد کو "نیر ایسٹ" وغیرہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بجنسہٖ یہی اعلان شائع کیا گیا تھا۔

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہند و انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں۔ اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کی تکرار و اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے، تو بلا خوف رد کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ یہ اعلان شائع کیا گیا شاید ہی کوئی انسانی وعدہ اس قدر دُہرایا گیا ہو۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس وقت میدانِ جنگ کا کیا حال تھا؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کے لیے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جس قدر ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اس کی کامیابی کی ضرورت تھی۔ اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بےچینی پیدا ہو جاتی تو انہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی اور آج نتائج کا کیا حال ہوتا۔

اس اعلان کا نتیجہ وہی نکلا جو مطلوب تھا۔ یعنی مسلمانانِ ہند پر

کے نامور ہیرو ڈیوک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے، تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا۔ لیکن قبضہ کے بعد جو نتیجہ نکلا اس پر تاریخ کا اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے، اور خود انگریز مؤرخوں کی زبانی اس کا افسانہ خونیں سن لیا جا سکتا ہے۔

خود ہندوستان کے گذشتہ سو سال کی تاریخ ہی اس کے لیے کافی ہے۔ دوسرے ملکوں کی سرگزشتوں کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟

شمشاد خانہ پرور ماز کے کمترات

تاہم بدبخت مسلمانوں نے بھروسا کیا اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ ان کا روپیہ، ان کی جانیں، ان کے ملک کی تمام قوتیں بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے مٹانے میں ان کی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی، اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جس کا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی و تباہی ہے۔

اثنائے جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فوج قابض ہو گئی تھی، جو جزیرۂ عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہے۔ عین حدود حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغاوت کرائی گئی اور اس کی وجہ سے جس قدر توہین اس مقدس مقام کی ہونی تھی وہ ہو کر رہی پھر بھی مسلمانانِ ہند اپنے اعتماد سے دستبردار نہ ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد ہی برطانوی اعلان و مواعید کی مقدس

پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سوسائٹی بھی اشخاص کے لیے ضروری سمجھتی ہے کہ ایفائے عہد میں اپنے تئیں شریف ثابت کریں لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کے لیے شریف ہونا چنداں ضروری بات نہیں ہے، اور اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا وہم و گمان بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ جب وعدوں کا ایفاء اور عہد و پیمان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جاتے جو اپنی وفاداری میں کتّے کی طرح قابل تعریف مگر بے زبانی میں اسی کی طرح بے بس بھی ہے۔

انگلستان کی حکومت نے نپولین کے عہد سے لے کر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے ان کی عبرت انگیز سرگذشت صفحات تاریخ پر ثبت ہے برطانی وعدوں کے اعتماد اور ان کے ایفا کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے۔ ۱۵ر جولائی ۱۸۱۵ء کو جب نپولین نے بدلا خان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا کچھ بے اعتمادی نہ کی تھی۔ لیکن خود اسی کے لفظوں میں " انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کے لیے بلایا، اور جب وہ آگیا تو اس کا خاتمہ کر دیا"

سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طوفانوں کے اندر انگریزی مواعید کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں

۴ر اگست ۱۸۱۵ء کو جنگ واٹرلو کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا، اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا جس پر انگلستان

نے اعلان کیا تھا کہ حملہ ان کی جانب سے ہے۔ انگلستان و خلفاء کی جانب سے نہیں ہے لیکن اب موجودہ حالت بالکل اس کے برعکس ہے یعنی خلیفۃ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفۂ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں۔ اور خلیفۃ المسلمین پر حملہ آور ہیں۔ پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا تو مسلمانوں کے لیے قطعاً صورت دفاع اور نفیرِ عام پیدا ہو جائے گی۔ جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ حملہ و ہجوم کی صورت نہ ہو گی کہ فرض علی الکفایہ ہو۔ لہٰذا ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ شرعی فرض ہو گا کہ خلیفۃ المسلمین، اور ان تمام اسلامی آبادیوں کی اعانت کے لیے اٹھ کھڑا ہو، جہاں سے اسلامی حکومت مٹائی جا رہی ہے

(۲) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی، مگر چار سال کی جنگ اور اس کے نتائج نے آخری درجۂ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفۃ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم حریفوں کے مقابلے کے لیے کافی ہے۔ نہ موجودہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی۔ یعنی وہ شکست کھا چکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی درماندگی و تباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے۔ جیسے ولایت سمرنا وغیرہ کے مسلمان، پس اس بنا پر بھی مسلمانانِ ہند کا فرض شرعی ہو گا کہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) جن بلادِ اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں، یا کر چکے ہیں مثلاً ایڈریا نوپل تھریس، ایشیائے کوچک، سمرنا، عراق، فلسطین، ان کے قرب و جوار

صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائے گی۔

موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ

بحث کے اس ٹکڑے کو ہم دانستہ حذف کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نہ ہم ان بہم اعلانات کا یہاں ذکر کریں گے جن کا سلسلہ برابر اثنائے جنگ میں بھی جاری رہا تا آنکہ وزیر اعظم کی تقریر ۵ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں اور صورت حال نے ان چیزوں کو دکھلا دیا ہے۔ ان کے لیے بحث و تشریح کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ نہ اب کوئی بات ہمارے لیے سوچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے۔ نہ گورنمنٹ کے لیے وہ صرف موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے۔

احکام شرعیہ اوپر گذر چکے ہیں۔ پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف وہی حملہ آورانہ جنگ عمل میں لائی گئی جس کا اظہار ہو رہا ہے، تو نتائج حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) جس وقت خلیفۃ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو برٹش گورنمنٹ

مجبور ہوں گے کہ دو راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ یا برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیں، یا اسلام کا، یہ ناممکن ہوگا کہ دونوں تعلق ایک میں جمع کیے جا سکیں۔

کیا چھ کروڑ سے زائد انسانوں کو اس کشمکش میں مبتلا کر دینا کوئی عاقبت اندیشانہ دخل ہو سکتا ہے؟ فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں۔ اگر عارضی فتح مندی کا گھمنڈ مہلت دے، تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کرے۔

اگر انگلستان کے وزراء (نپولین کے لفظوں میں) وعدہ اس لیے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے، تو کم از کم اس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے جس کو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کامل مذہبی آزادی کا وعدہ اسی وعدہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روزمرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی مسجدیں قائم ہیں۔ پانچ وقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ کوئی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو۔

لیکن اگر برٹش گورنمنٹ بلادِ اسلامیہ کے خلاف اپنے موجودہ طرز عمل پر قائم رہی، اس کے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لیے سمندروں میں دوڑتے رہے، اس کی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرۃ العرب میں داخل ہے اور ساتھ ہی وہ اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بدبخت مسلمان اس کے وفادار بنے رہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں تو آزادی دینے کے لیے تیار ہے، لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور

میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے اور اس کی اعانت کی وجہ سے مسلمانانِ ہند بری الذمہ ہو جائیں۔ پس اس بنا پر بھی ساری شرعی ذمہ داری مسلمانانِ ہند ہی کے ذمہ عائد ہوتی ہے۔ جن کی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ ہے اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں۔

(۴) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرۂ عرب میں داخل ہے۔ پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا، یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا، تو یہ صریح جزیرۂ عرب پر غیر مسلم اقتدار ہو گا۔ اور از روئے شرع مسلمانانِ ہند کا فرض ہو گا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کے لیے حریف کا مقابلہ کریں۔

(۵) بیت المقدس اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں داخل ہے۔ اگر اس پر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائے گا تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہو گا کہ دفاع کے لیے مستعد ہو جائیں۔

(۶) غرضکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً ناجائز ہو جائے گا اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کشمکش ہو گی جس میں کوئی انسانی جماعت مبتلا ہو سکتی ہے۔ یعنی بجز ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت از روئے شرع یہ ہو جائے گی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے اور اس لیے اس سلوک کی مستحق ہے جو از روئے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیئے جب ایسا ہو۔ تو مسلمان

بھی بڑھ کر اور ہزار روزوں سے بھی اشد و اہم ہے، اور جن کی نافرمانی کے بعد نہ تو اُن کی نمازیں ہی اُن کے لیے سودمند رہیں گی نہ اُن کے روزے ہی اُن کو نجات دلا سکیں گے؟

ترک و اختیار

ترکِ موالات

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک و اختیار، دونوں طرح کے احکام شرعاً ہوں گے۔

"ترک" سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت کر رہے ہیں، ترک کر دینی پڑیں گی۔

"اختیار" سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت نہیں کر رہے ہے کرنی پڑیں گی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز وُہ ہے جس کو شریعت نے "ترکِ موالات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور و فریق کا حکم رکھتے ہوں، اُن سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں، اگر کوئی مسلمان ایسا تعلق رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہو گا۔ مسلمانوں میں نہ ہو گا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی۔ تمام غیر مسلم

ان بڑے حکموں میں داخل ہیں۔ جن کے ترک کر دینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا۔ ان کے لیے چاہتی ہے کہ حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں۔

وہ مسلمانوں کو آزادی دیتی ہے کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسلامی خلافت و امامت پر حملہ آور بھی ہے جو شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ کے حکم میں داخل ہے۔

وُہ نماز پڑھنے میں مداخلت نہیں کرے گی جس کے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہگار ہو جاتا ہے لیکن خلیفۃ المسلمین کو ان کی حکومت و مملکت سے محروم کر دے گی۔ جن کی مدد نہ کرنے سے مسلمان گنہ گار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے باہر ہو جاتا ہے۔

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی۔ کیونکہ ان کا مذہبی عمل ہے۔ لیکن وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنی فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کرے گی، کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالے کر دیں۔ اس وقت مسلمان دفاع کے لیے اُٹھیں گے تو کہے گی کہ بغاوت ہے۔ پھر کیا دفاع مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا۔ اور کیسا مذہبی عمل! ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھ کر، حج اس کے لیے چھوڑ دیا جا سکتا ہے، لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔

مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور ان کے اندر کی نمازوں کو لے کر کیا کریں گے جن کی اجازت دے دینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے جبکہ شریعت کے وُہ احکام ان کے سامنے آجائیں گے جن کی تعمیل ہزار نمازوں سے

عدوی و عدوکم اولیاء، تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق؟ مسلمانو! جو غیر مسلم تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ان کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ اور سورۃ مائدہ میں ہے: لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء، بعضھم اولیاء بعض۔ ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان یہود و نصاریٰ کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں، اپنا دوست نہ بناؤ اور جو مسلمان بنائے گا، خدا کے حضور اس کا شمار بھی انہی میں ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ واضح فرمایا۔ لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و اور لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم جنگ ہو تو مسلمانوں کو اپنا دوست بنائیں من دون المومنین" جہاں جہاں آیا ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترکِ موالات نہیں ہے، بلکہ ایک خاص قسم کے محارب غیر مسلموں سے اور ایک خاص حالتِ جنگ میں اسی طرح سورۃ عمران میں ہے: لاتتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودّوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر

یہاں ضمناً یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو شرعاً کیسا تعلق رکھنا چاہیئے؟ سو معلوم ہو گیا کہ قرآن کی اس تقسیم کی بموجب وہ دوسری قسم میں داخل ہیں پس ان کے ساتھ بر و احسان اور نیکی و ہمدردی

اقوام وافراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں، نہ ان پر حملہ آور ہیں، نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں یعنی لڑتے ہیں۔ حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اسلام کا یہ حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی ومحبت اور ہر طرح کے احسان وخیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیئے۔ اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں۔ عالمگیر محبت اس کی دعوتِ حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وُہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں۔ اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت درگزر کر سکتی ہے۔ لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرنا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے، تو یہ گناہ نہیں ہے، نفاق ہے اور منافق مومن نہیں ہے۔

قرآن نے یہ تقسیم سورۃ ممتحنہ میں کر دی ہے۔ لاینھاکم اللہ عن الذین یقاتلونکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم، ومن یتولھم فاولئک ھم الظٰلمون

اور اسی صورت کے اوائل میں فرمایا: یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا

اس پر سورۂ ممتحنہ کا نزول ہوا۔

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ، وقد کفروا بما جاءکم من الحق۔

مسلمانو! خدا کے اور خود اپنے دشمنوں کو پیارا دوست نہ بناؤ کہ محبت والفت کے ساتھ ان سے تعلقات رکھو یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام سے انکار کر چکے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کا برحق ہونا کے دشمن ہیں۔

(ممتحنہ)

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین و بدریین میں سے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے خیال سے خط لکھا تھا۔ دشمنان اسلام کی مدد کرنا مقصود نہ تھا۔ اس پر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا۔ اور حضرت عمرؓ قتل کر دینے کے لیے اٹھے کہ یہ منافق ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ جب باوجود علاقہ قرابت مخالف ومحارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا تو پھر ان مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے۔ جو برٹش گورنمنٹ کے محارب فریق ہوتے پر بھی، ہر طرح کی محبت وموالات اور اعانت ومشارکت کے تعلقات اس کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور جن کا اب تک یہ حال ہے کہ ان کے درباروں کے دیئے ہوئے بے سود خطابوں کو بھی ترک کر دینا ان کے نفس حق فراموش پر گراں گزر رہا ہے۔

علی الخصوص ان مدعیان علم وتقدس کا حال قابل تماشا ہے جن کو ان کی بارگاہوں سے شمس العلماء کے خطابات ملے ہیں یہ وہ لوگ ہیں

کرنے سے شریعت ہرگز ہرگز نہیں روکتی۔ آج تک انہوں نے نہ کبھی اسلامی ممالک پر حملہ کیا، نہ مسلمانوں سے قتال فی الدین کیا، نہ کسی اسلامی ملک سے مسلمانوں کے اخراج کا باعث ہوئے۔

واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ

سورۂ ممتحنہ کے شانِ نزول کا واقعہ اس بارے میں مسلمانوں کے لیے بڑا ہی عبرت انگیز ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین صحابہ اور شرکاء بدر میں سے تھے۔ آنحضرت صلعم نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک خط لکھ کر مکہ میں اطلاع دے دینی چاہی۔ وحی الٰہی سے آنحضرت اس پر مطلع ہو گئے اور راستے ہی میں سے خط پکڑ وا منگوایا۔ جب حاطب سے پوچھا گیا تو انہوں نے معذرت کی "مافعلت هذا كفرا ولا ارتدادا" میں نے کفر و ارتداد اور اسلام کی مخالفت کے خیال سے ایسا نہیں کیا۔ صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے خط بھیج دیا تھا۔ میری نیت بُری نہ تھی حضرت عمرؓ نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں اور کہا "انه منافق قد خان الله ورسوله"۔ یہ منافق ہے اس نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے

سورۂ نساء میں یہ تمام خصلتیں منافقوں کی قرار دی ہیں جن میں آج ہمارے بڑے بڑے مدعیانِ علم و مشیخیت مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اسلام و کفر، دونوں سے ساز باز رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں، اور اسلام کے مخالفوں سے بھی رسم و راہ جاری رہے "مذبذبین بین ذلک لا الی ھؤلاء و لا الی ھؤلاء ....

تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا: "یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین اتریدون ان تجعلوا اللہ علیکم سلطانا مبینا؟ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار

اسلام تو ایک مسلمان کے لیے یہ بات بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اُس کے ماں باپ، بھائی بہن، مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں تو ان سے بھی کسی طرح کا واسطہ رکھے: لا تتخذوا اباءکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولھم منکم فاولئک ھم الظلمون ....

(۹ : ۲۳) اور جو مسلمان ایسے وقتوں میں محارب غیر مسلموں سے محبت و اعانت کا تعلق رکھیں، خواہ وہ ان کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ اُن کے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے: لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر، یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم (۵۸ : ۲۲) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بن کر دنیا کو دکھلا دیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں؟

جو اپنے تئیں اسلام کی دینی ریاست کا اوّلین حق دار اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں۔ یا سبحان اللہ! مسلمانوں پر ان کی قومی بدبختی کا اس سے بڑھ کر اور کونسا وقت آسکتا ہے؟ جن لوگوں کو اسلام اور اسکی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو، اور جو اللہ کے نزدیک اس کے بھی حقدار نہ ہوں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں ان کو مسلمانوں کی ریاست و پیشوائی کا دعوئی ہو، وہ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہوں کے مالک ہوں، جہاں صبح و شام قال اللہ اور قال الرسول کا چرچا رہتا ہے۔ اور پھر اس سے بھی عجیب تو یہ کہ بہت سے مسلمان ہوں گے جو ان کی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہوں اور اُن کے آگے عقیدت و ارادت کے سر جھکا کر اللہ اور اُس کے رسول سے گردن موڑ رہے ہوں۔

مدارِ روزگار سفلہ پرور را تماشا کن

الذین یتخذون الکفرین اولیاء من دون المؤمنین أیبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعًا!	جو مسلمان مسلمانوں کو چھوڑ کر اُن کے مخالف غیر مسلموں کو اپنا دوست بناتے ہیں تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بارگاہوں سے عزت حاصل کریں؟ اگر عزت ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ اصلی عزت

دینے والے وہ نہیں ہیں، عزت اللہ کے لیے ہے اور ایک مسلمان کو عزت مل سکتی ہے تو اسی کی چوکھٹ سے۔

اختیار کریں، اور دشمنان ملت کے دفاع میں باوجود استطاعت حصہ نہ لیں، اُن سے بھی مسلمانوں کو ترکِ موالات کر دینا چاہیئے۔

امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے هل للامام ان یمنع المجرمین و اهل المعصیة من الکلام معه والزیارة ونحوه؟ یعنی کیا مسلمانوں کے امام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ جو لوگ شرعی جرائم کے مرتکب ہوں۔ ان سے ملنے، بات چیت کرنے اور اسی طرح کے تعلقات رکھنے سے لوگوں کو روک دے؟ اور پھر اس میں حضرت کعب بن مالک کی روایت درج کی ہے۔ گویا اس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کو ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے اور عبرت پذیری کے لیے ایسا کرنا اعمال نبوت کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوگا۔

امام بخاری کا یہ استدلال نہایت واضح اور صاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی طرح کا واسطہ ان لوگوں سے نہ رکھیں، نہ سلام کریں، نہ کلام کریں، نہ ملیں جلیں۔ یہاں تک کہ ان کی بیویوں تک کو تعلقات زوجیت رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ آخر یہ حالت ہوگئی کہ "ضاقت علیهم الارض بما رحبت" پس اس سے ثابت ہوا کہ جب کبھی اسلام اور امت کی حفاظت اور دفاع کا وقت آجائے اور تمام مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا ضروری ہو تو جس مسلمان کی طرف سے اس میں سستی دکھائی جائے یا انکار و تخلف ہو اس کا جرم عند اللہ نہایت شدید و عظیم ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو حق پہنچتا ہے کہ زجر و تنبیہ کے لیے اس کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ان تینوں شخصوں کے ساتھ کیا گیا تھا، اور جب تک وہ اپنے رویہ سے باز نہ آجائیں کوئی مسلمان اُن سے کسی طرح

پس اب فیصلہ کر لو کہ اُن لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو لیسے وقتوں میں بھی محارب غیر مسلموں کے دیئے ہوئے خطابوں سے پیار کریں گے اُن کے دیئے ہوئے تمغوں کو، (جن میں سے اکثر اسلام فروشی ہی کے صلہ میں ملے ہیں) اپنے سینوں پر جگہ دیں گے، اُن کی بارگاہوں میں جا کر اطاعت و تعبد کا سر جھکائیں گے، اور آہ! اُن سب سے بڑھ کر وہ، جو ان کی راہوں میں غلاموں کی طرح بچھیں گے، اُن کے حکموں پر کتوں کی طرح لوٹیں گے، اُن کی خدمت و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان تک کو نثار کر دیں گے؟ فیاللہ وللمسلمین من ھذہ الفاقرۃ التی ھی اعظم فواقر الدین، والرزیۃ التی ما رزی بمثلھا سبیل المومنین!

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام و ایمان

ھل للامام ان یمنع المتخلفین والقاعدین من الکلام معہ والزیارۃ ونحوہ؟

ایک اہم سوال شرعاً یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مسلمان باوجود تبلیغ و تفہیم محارب غیر مسلموں سے ترکِ موالات نہ کریں اور ان کی مودت و اعانت سے باز نہ آئیں۔ اُن کے ساتھ مسلمانوں کو کیا سلوک کرنا چاہیئے۔؟

حضرت کعب بن مالک اور غزوۂ تبوک کے متخلفین کا واقعہ گزشتہ باب میں گزر چکا ہے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مسلمان مصالح امت کے خلاف روش

دن سے زیادہ اپنے بھائی مسلمان سے جُدا رہے۔ تو اس سے مقصود وُہ جدائی ہے جو بلا سبب شرعی ہو۔ اور اس واقعہ میں جدائی کا حکم جرم شرعی کے ارتکاب کی بنا پر ہوا۔ پس زیادہ عرصہ تک ترک علائق جائز ہے۔

حافظ ابن قیم نے بھی ھدی میں اس واقعہ سے یہ حکم مستنبط کیا ہے اور اپنے مخصوص طرز میں مشرح بحث کی ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

بیجا نہ ہوگا، اگر یہاں ایک شبہ دور کر دیا جائے جو اس معاملہ کی نسبت ہوا ہے اور ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "استدل بعض المتأخرین لکونہما لم یشہدا بدراً بما وقع فی قصۃ حاطب وان النبی صلعم ماھجرہ ولاعاقبہ مع کونہ جس علیہ بل قال لعمر لما ھم بقتلہ: لعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم: قال واین ذنب التخلف من ذنب الجس؟" یعنی بعض متأخرین نے اس سے انکار کیا ہے کہ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ شہدار بدر میں سے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کو یہ سزا نہ دی جاتی۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ سے خط و کتابت کی اور وُہ جرم بڑا ہی سخت جرم تھا۔ یعنی جاسوسی کا تھا۔ اس پر بھی بوجہ بدری ہونے کے آنحضرت نے

کا علاقہ نہ رکھے جب ان مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک جائز ہوا، جو سابقین انصار اور شرکاء بدر میں سے تھے اور جن کا قصور بجز سستی اور کاہلی کے اور کچھ نہ تھا، تو جو لوگ صریح طور پر اعدائے اسلام کے ساتھ اطاعت و اعانت کے تعلقات رکھیں اور دفاعِ اسلام کی سعی و تدبیر میں شامل ہونے سے صاف صاف انکار کر دیں اُن کے لیے تو ایسا حکم دینا نہ صرف جائز و مشروع ہوگا۔ بلکہ یقیناً واجب و لازم ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے امام حسن بصری کا کیا خوب قول نقل کیا ہے یا سبحان اللہ إما اکل ھؤلاء الثلاثۃ مالاً حراماً، ولا سفکوا دماً حراماً ولا افسدوا فی الارض اصابھم ما سمعتم، وضاقت بھم الارض بما رحبت فکیف بمن یواقع الفواحش والکبائر؟

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: وفیھا ترک السلام علی من اذنب و جواز ھجرہ اکثر من ثلاث واما النھی عن الھجر فوق الثلاث فمحمول علی من لم یکن ھجرتہ شرعیاً۔[1] یعنی اس واقعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مجرمین شرع سے ترکِ سلام و کلام کرنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ان سے ترکِ تعلق کیا جا سکتا ہے۔ باقی رہی حدیث لا یحل لرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث، یعنی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین

---

[1] امام بخاری اپنی عادت کے مطابق حدیث کعب کو مختلف ابواب میں لائے ہیں۔ باب متذکرہ متن کتاب الاحکام کا آخری باب ہے اور مفصل حدیث کتاب المغازی میں ہے۔ کتاب المغازی کی شرح میں حافظ موصوف کی یہ عبارت ملے گی۔ (جلد ۸۔ ۹۴)

دونوں معاملے اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس واقعہ پر جن لوگوں کو تعجب ہوا، انہوں نے حکم دفاع کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی۔ اگر اس پر غور کر لیتے تو یہ شبہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ نہ ان کی کمزور توجیہوں کی ضرورت پیش آتی۔

ایک صورت عام طور پر حفظ ملک و نصرت قوم کی ہے اور ایک صورت خاص دشمن کے حملہ و ہجوم کی ہے۔ پہلی حالت میں اگر جنگی احکام کی تعمیل میں سستی و کاہلی ہو تو اس درجہ سنگین نہیں ہوتی جس قدر دوسری حالت میں، پہلی حالت اندرونی امن کی ہے۔ دوسری بیرونی حملہ و جنگ کی جنگ و دفاع کی حالت میں ایک ذرا سی سستی اور کاہلی بھی اتنا بڑا جرم ہوتی ہے کہ اس کی پاداش میں موت کی سزا کو بھی سخت نہیں کہا جا سکتا۔

اسی بنا پر شریعت نے ایک حالت تہیۂ جہاد و رباط خیل و استعداد کار کی قرار دی ہے۔ دوسری حالت "دفاع" اور نفیر کی بتلائی جب کسی دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہو اور مسلم و غیر مسلم جنگ کی حالت پیدا ہو گئی ہو، تو وہ حالت دفاع کی ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں امن تھا۔ قریش یا کسی دوسرے دشمن کی طرف سے اس وقت حملہ کا خوف نہ تھا، خود مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے۔ کیونکہ قریش نے اپنا عہد و میثاق توڑ دیا تھا۔

لیکن حضرت کعب بن مالک کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہوں نے اس وقت ادائے فرض میں سستی کی جب دشمن کے حملہ و ہجوم کا اعلان ہو چکا تھا۔ اور چالیس ہزار رومیوں کے اجتماع کی خبریں آ چکی تھیں، وہ حملہ کا وقت

معاف کر دیا اور لوگوں کو ان کے ساتھ ترک تعلق کا حکم نہیں دیا۔ کعب اور ان کے ساتھیوں کا اس سے بڑھ کر تو قصور نہ تھا؟ پھر اتنی بڑی سخت سزا ان کو کیوں دی گئی؟ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاطب کی معافی اُن کے بدری ہونے کی وجہ سے تھی، اور یہ لوگ اس لیے ماخوذ ہوئے کہ بدری نہ تھے۔ انتہا۔

پھر حافظ موصوف نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ ضرور بدری تھے حاطب کو اس لیے کوئی سزا نہیں دی گئی کہ انہوں نے اپنے اہل وعیال کی حفاظت کا عذر پیش کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ پھر آگے چل کر سہیلی کا جواب نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کو سخت سزا اس لیے دی گئی کہ انصار میں سے تھے اور انصار نے آنحضرتؐ کی حمایت کا خاص طور پر وعدہ کیا تھا۔ اُن پر دوسروں سے کہیں زیادہ معیت ونصرت فرض تھی، اس میں کوتاہی ہوتی تو مستحق تعزیر ہوئے۔

ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شبہ جس قدر تعجب انگیز ہے اُس سے کہیں زیادہ ان اکابر اعلام کے جوابات وتعلیلات تعجب انگیز ہیں سخت حیرانی ہوتی ہے کہ ایک نہایت صاف وواضح معاملہ کی نسبت کیوں اس قدر غیر ضروری کاوشیں کی گئیں اور کیوں اصلی علت سامنے نہ آگئی:

حضرت ہلال اور مرارہ کا بدری ہونا مسلّم ہے۔ بخاری کی روایت میں حضرت کعب کہتے ہیں "رجلین صالحین قد شهدا بدرًا" اور حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ اور اس معاملہ میں کسی طرح کی منافات نہیں ہے۔

ہے جو اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔

فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کا نشہ چند لمحوں کے لیے عقل و انصاف کو کام کرنے دے۔

مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو۔ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیرِ درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟

اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔

یا مسلمانوں کے لیے اُن کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اُن کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو جائیں۔

یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی اس کو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ حکومت چاہیے۔ موصل کے تیل کے چشمے چاہئیں۔ عراق کی زرخیز زمین کی دولت چاہیے۔ اور اسلامی خلافت کا خاتمہ، تاکہ دنیا میں اس کا کوئی حریف باقی

نہ تھا۔ دفاع کا تھا۔ امام نے حکم دے دیا تھا، اور نفیرِ عام کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت ادائے فرض میں غفلت کرنا ایسا سنگین جرم ہے کہ کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا۔ پس ضروری تھا کہ عبرت کے لیے کوئی سخت طرزِ عمل اختیار کیا جاتا، تاکہ آئندہ ایسی غفلتوں کی کسی کو جرأت نہ ہو۔

تعجب ہے کہ حافظ ابن قیم کو بھی ہدیٰ میں یہی شبہ لاحق ہوا اور اسی لیے انہوں نے ہلالؔ اور مرارہ کے بدری ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ والغلط لا یعصمہ الانسان۔

برٹش گورنمنٹ کیلئے اصلی سوال

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض ہی سامنے رکھ کر غور کرلے، کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہیں، ایک ایسی اٹل اور لاعلاج کشمکش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہیں دوسری طرف برٹش گورنمنٹ! اور دونوں باتیں اس طرح آپس میں لڑ گئی ہیں کہ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتیں!

اگر انسان کے ہاتھ اشارے کرکے طوفان اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح سمندر کے کنارے کھڑی

بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں، کمیٹیاں بناتے ہیں کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں، شریعت کی نظروں میں "بھیڑ" اور "انبوہ" کا حکم رکھتی ہیں "جماعت" کا حکم نہیں رکھتیں۔ "بھیڑ" اور "جماعت" میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے۔ جب کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کے لیے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیتے ہیں۔ وہاں ان کے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دے دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے۔ افراد و اشخاص کوئی شی نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و عادات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں۔ اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

نہ رہے۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی احکام منصادم ہوتے ہیں تو ہوں۔ اگر ان پر طرح طرح کے اشد فرائض عائد ہو جاتے ہیں تو ہوا کریں۔ ان کو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار غلام بنا رہنا چاہیے اگرچہ اس کی خاطر اپنے مذہب سے بھی دستبردار ہو جانا پڑے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لیے بھی نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں، اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام، ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں۔

نظامِ عمل

مسلمانانِ ہند اور نظامِ جماعت

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا تھا، صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

اس بارے میں مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔

"جماعتی زندگی کی معصیت" سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت"

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنی جدّوجہد کی تمام گزشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کردی، حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آگیا جس کی تباہیوں کا تخیّل پیدا کر کے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے۔ فقد جاء اشراطها۔ فانی لهم اذ جاءتهم ذکراهم؟ (۴۷: ۲۱) اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیئے تو اسی کا سچے کام کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے۔ مگر جب بھی کیا جائے سچائی ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف۔ اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائے گی معصیت اور ہلاکی ہے۔ لیکن جب کبھی کر دیا جائے، سچائی اور نیکی ہے اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی ہے۔

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سُن پاتے ہو اور پھر چیخنے چلّانے لگتے ہو۔ اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اُٹھتا ہے، یکایک اعتقاد اور عمل دونوں تمہیں یاد آجاتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں میں ہی تمہاری معصیت وجود میں آتی ہے۔ نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے۔ تمہاری معصیت دائمی، تمہارا ماتم ہمیشگی کا، تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہُوا۔ اور تمہاری نحوست ۲۴ گھنٹے تمہاری ساتھی ہے اور ٹھیک اسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سائے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے مسلمانانِ ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں۔ اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے۔

کتاب و سنت نے جماعتی زندگی کے تین رُکن بتلاتے ہیں:

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہو جائیں۔ اور وہ ان کا امام ہو۔

وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں۔

قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، ان کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گونگی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو سب کے دماغ بیکار ہو جائیں صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے۔ کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے۔ مگر نہ تو "جماعت" نہ "قوم" نہ "اجتماع" اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں۔ کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکڑے ٹکڑے کر دی جا سکتی ہیں۔ مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر لے سکتی ہے۔

کسی گزشتہ فصل میں بہ ضمن شرح حدیث حارث اشعری "جماعت" کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔ اس موقع پر وہ پیش نظر رہے۔

رہا ہے کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دائیں بلاتا ہے، کوئی بائیں،
کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا
پورا عذر ہے، یہ مہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی
ضرورت ہے۔ جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور
ہو۔ وہ اصولِ شرعیہ کو مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت پر اُن کے توطن ہند
کی حدیث العہد نوعیت پر ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادثِ
جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرے اور پھر تمام مصالح و مقاصد
شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوئے شرع صادر کرتا رہے
نہ ہر عالم اس کا اہل ہے، نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت
سے انجام پا سکتا ہے اس کو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے
حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وُہ قوت بھی ناپید؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں، وہ جوش و سرگرمی کی
کمی ہے، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل نہ اختیار کی گئی تو
یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جا سکتی ہے۔ جذبات کی مثال
اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ بھی بغیر
مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اس کی طاقت کو ترتیب
دیتی اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو اس

تم وقت پر سامنے آ جانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھُلے جاتے ہو! اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے، جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روز نئے نئے روگ لگتے رہیں گے۔ خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہُوا۔ پس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے، اور قوم و فرد دونوں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے۔ اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے۔ ایمان کی گم گشتگی اور محرومی کا ہے ؎

درازیٔ شب و بیداریٔ من ایں ہمہ نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفت است

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے! اگر آج مسلمانوں میں ان کے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے تو ان میں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا، کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کاربند ہو جاتے لیکن اس کے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اُس قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہیے۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے۔ ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر

نہیں رہ سکتی۔

نظامِ شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکھے جائیں کہ علمی راہ کیا ہونی چاہیے؟ اور ہر شخص یا چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کردے یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جس کو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو۔ وہ وقت اور حالت پر اصول و احکامِ شریعت کو منطبق کرے گا۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کارروائی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالے گا۔ امت و شرع کے اصول و مصالح و مقاصد اُن کے سامنے ہوں گے۔ کسی ایک گوشے ہی میں منتفرق نہ ہو جائے گا۔ کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہو جائے۔

حفظت شیئًا و غابت عنك اشیاء!

سب سے بڑھ کر یہ اعمالِ مہمہ امّت کی راہِ حق میں منہاج نبوت پر اس کا قدم استوار ہوگا اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت، ہر تغیر، ہر حالت، ہر جماعت کے لیے احکامِ شرعیہ کا استنباط کر سکے گا۔

زبان زنکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

عزیزانِ ملّت! اس طول طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں

سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ کاش وہ نہ ہوتی وہ ٹرین کو منزلِ مقصود پر پہنچاتی ہے۔ مگر انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو بھی ہلاک بھی کر دیتی ہے۔

"جذبات" اسی وقت کام دے سکتے ہیں۔ جب ان کو مرتب کرنے اور ان پر حکم و قضا کے لیے "ادراک" اور "دماغ" بھی موجود ہو۔ وذالک من عمل النبوۃ ولکن لا یعقلھا الا العالمون۔

بہرحال اس وقت اور ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے "راہ عمل" یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں۔ اسی پر مسئلہ خلافتِ اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں۔

تمام مسلمانوں کو ان ہمدردانِ ملت کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اس کی شاخوں کے قیام کا سروسامان کیا۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام، مسلمانوں کو نظام جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی، ایجی ٹیشن جاری رکھے گی۔ تبلیغ و اشاعت کرے گی۔ لیکن نہ تو وہ قوم کو سنبھال سکتی ہے نہ کمیٹیوں سے "جماعت" پیدا ہو سکتی ہے نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ وہ خواہ احکامِ شرعیہ کے علم کے بجائے اپنے قیام و تکمیل کے لیے۔ رفع تفرقہ و انتشار کے لیے اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کے لیے ایک بالاتر قوتِ حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے، اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اس کی ہستی بھی قائم

کی چیخ بن کر نکلتی تھیں۔ مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں؟ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے۔

تم نے ہمیشہ اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم و استغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا (۱۷ : ۷) کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا جب کوئی بھیڑ دیکھی۔ فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لیکن فلم یزدھم دعائی الا فرارا (۱۷ : ۶) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشۂ قید و بند میں چلا گیا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آگیا ہوں۔ لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیساکہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے اسٹیشنوں پر اتارو، ایسے پُر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں، اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کردو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جاتے مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو

کوئی بات بھی ایسی نہیں جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وُہی افسانہ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دُہراتا رہا ہوں۔ اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں، تو تم اس کی تصدیق کروگے۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی راہیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں۔ لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا۔ اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بُلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں ولکن لا تحبون الناصحین افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور ہنگامہ کے بندے اور وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر دوڑکر آتے ہو۔ اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو، تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دل ہے نہ دماغ، وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا تبلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب

بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسوں گری ہے: اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ و اصیلا (۲۵: ۷) لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب اُسی "ما فوق الفطرت" دعووں اور "ساحرانہ فصاحت طرازیوں" کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو، اور "قیام شریعت" اور "تقدیم و اتباع شریعت" اور "حفظ و دفاعِ ملت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔

پس جبکہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہیں، تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رُخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بتلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے۔ مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو، اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو! فستذکرون ما اقول لکم، وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد (۴۰: ۴۴)

لے کر کیا کروں گا۔ جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہو۔ اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو۔ جب تمہاری رُوحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہوں۔ افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں مَیں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نہ جست اسرار من
سرِّ من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را گوش آں منظور نیست

میری راہوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی۔ نہ میرے سفر میں کبھی یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں، انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع۔ لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا۔ وہ میرے عقائد و معلومات تھے۔ تمہارے بڑوں کی آراء و مظنونات نہ تھے۔ و ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔

(۴ ھ : ۳) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزا کیا۔ کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرت دعووں کا اعلان ہے: یرید ان یتفضل علینا

۱۰ الولید بن الملک	۸۶	۷۰۵ء
۱۱ سلیمان بن عبدالملک	۹۶	۷۱۴ء
۱۲ عمر بن عبدالعزیز	۹۹	۷۱۷ء
۱۳ یزید بن عبدالملک	۱۰۱	۷۱۹ء
۱۴ ہشام بن عبدالملک	۱۰۵	۷۲۳ء
۱۵ الولید بن یزید بن عبدالملک	۱۲۵	۷۴۲ء
۱۶ یزید بن الولید	۱۲۶	۷۴۳ء
۱۷ ابراہیم بن الولید	۱۲۶	۷۴۳ء
۱۸ مروان بن محمد بن مروان	۱۲۷	۷۴۴ء

سلسلۂ عباسیہ

۱۹ ابوالعباس سفاح	۱۳۲	۷۴۹ء
۲۰ ابوجعفر منصور	۱۳۷	۷۵۴ء
۲۱ المہدی بن منصور	۱۵۸	۷۷۴ء
۲۲ الہادی بن المہدی	۱۶۹	۷۸۵ء
۲۳ ہارون الرشید بن المہدی	۱۷۰	۷۸۶ء
۲۴ محمد الامین بن ہارون	۱۹۳	۸۰۸
۲۵ المامون بن ہارون	۱۹۸	۸۱۳
۲۶ المعتصم بن ہارون	۲۱۸	۸۳۳

ضمیمہ

جدولِ سنینِ خلافتِ اسلامیہ

عدد	خلفاء	سنہ ھجری	سنہ مسیحی
۱	ابوبکر صدیق (رضؓ)	۱۱	۶۳۲
۲	عمر بن الخطاب (رضؓ)	۱۳	۶۳۴
۳	عثمان بن عفان (رضؓ)	۲۳	۶۴۴
۴	علی بن ابی طالب (رضؓ)	۳۵	۶۵۲

سلسلۂ بنو امیّہ

عدد	خلفاء	سنہ ھجری	سنہ مسیحی
۵	معاویہ بن ابی سفیان	۴۱	۶۶۱
۶	یزید بن معاویہ	۶۰	۶۸۰
۷	معاویہ بن یزید	۶۴	۶۸۳
۸	مروان بن الحکم	۶۴	۶۸۳
	الملک بن مروان	۶۵	۶۸۴

۴۶ الرشد بن المسترشد	۵۲۹	۱۱۳۵
۴۷ المقتفی بن المستظہر	۵۳۰	۱۱۳۶
۴۸ المستنجد باللہ بن المقتفی	۵۵۵	۱۱۶۰
۴۹ المستضئ بنور اللہ بن المستنجد	۵۶۶	۱۱۷۰
۵۰ الناصر لدین اللہ بن المستضئ	۵۷۵	۱۱۸۰
۵۱ الظاہر باللہ بن الناصر	۶۲۲	۱۲۲۵
۵۲ المستنصر باللہ بن الظاہر	۶۲۳	۱۲۲۳
۵۳ المستعصم باللہ بن المستنصر	۶۴۰	۱۲۴۳

عباسیہ مصر

۵۴ المستنصر باللہ	۶۵۶	۱۲۵۸
۵۵ الحاکم بامر اللہ	۶۶۱	۱۲۶۲
۵۶ المستکفی باللہ	۷۰۱	۱۳۰۱
۵۷ الواثق باللہ	۷۴۰	۱۳۳۹
۵۸ الحاکم بامر اللہ	۷۴۲	۱۳۴۱
۵۹ المعتضد باللہ	۷۵۳	۱۳۵۲
۶۰ المتوکل علی اللہ	۷۶۳	۱۳۶۱
۶۱ الواثق باللہ	۷۸۵	۱۳۸۳
۶۲ المستعین باللہ	۸۰۸	۱۴۰۶

۲۷	الواثق بن المعتصم	۲۲۷	۸۴۲
۲۸	المتوکل علی اللہ بن المعتصم	۲۳۲	۸۴۷
۲۹	المستنصر باللہ بن المتوکل	۲۴۷	۸۶۱
۳۰	المستعین باللہ بن المعتصم	۲۴۸	۸۶۲
۳۱	المعتز باللہ بن المتوکل	۲۵۲	۸۶۶
۳۲	المہتدی باللہ بن الواثق	۲۵۵	۸۶۹
۳۳	المعتمد باللہ بن المتوکل	۲۵۶	۸۷۰
۳۴	المعتضد باللہ بن الموفق	۲۷۹	۸۹۲
۳۵	المقتدر باللہ بن الموفق	۲۹۵	۹۰۸
۳۶	الراضی باللہ بن المقتدر	۳۲۲	۹۳۳
۳۷	المقتفی باللہ بن المعتدر	۳۲۹	۹۴۰
۳۸	المستکفی باللہ بن المقتفی	۳۳۱	۹۴۴
۳۹	المطیع باللہ بن المقتدر	۳۴۴	۹۴۶
۴۰	الطائع باللہ بن المطیع	۳۶۳	۹۰۲
۴۱	القادر باللہ بن المقتدر	۳۸۱	۹۹۱
۴۲	القائم بامر اللہ بن القادر	۴۲۲	۱۰۳۱
۴۳	المقتدی باللہ بن القائم	۴۶۷	۱۰۷۵
۴۴	المستظہر باللہ بن المقتدی	۴۸۷	۱۰۹۴
۴۵	المسترشد باللہ بن المستظہر	۵۱۲	۱۱۱۸

۸۰	محمد رابع	۱۰۵۳	۱۶۷۴
۸۱	سلیمان ثانی	۱۰۹۹	۱۶۸۷
۸۲	احمد ثانی	۱۱۰۲	۱۶۹۱
۸۳	مصطفیٰ ثانی	۱۱۰۶	۱۶۹۵
۸۴	احمد ثالث	۱۱۱۵	۱۷۰۳
۸۵	محمود اوّل	۱۱۴۲	۱۷۳۰
۸۶	عثمان ثالث	۱۱۶۰	۱۷۵۴
۸۷	مصطفیٰ ثالث	۱۱۷۱	۱۷۵۷
۸۸	عبدالحمید اوّل	۱۱۸۷	۱۷۷۳
۸۹	سلیم ثالث	۱۲۰۳	۱۷۸۹
۹۰	مصطفیٰ رابع	۱۲۲۲	۱۸۰۵
۹۱	محمود ثانی	۱۲۲۳	۱۸۰۸
۹۲	عبدالمجید	۱۲۵۵	۱۸۳۹
۹۳	عبدالعزیز	۱۲۷۷	۱۸۶۱
۹۴	مراد خامس	۱۲۹۳	۱۸۷۶
۹۵	عبدالحمید ثانی	۱۲۹۳	۱۸۷۶
۹۶	محمد خامس	۱۲۲۴	۱۹۰۸
۹۷	امیرالمومنین السلطان محمد خان سادس، خلد اللہ ملکہ و شوکتہ	۱۳۳۶	۱۹۱۸

۶۳ المعتضد باللہ	۸۱۵	۱۴۱۲
۶۴ المستکفی باللہ	۸۴۰	۱۴۴۱
۶۵ القائم بامر اللہ	۸۵۴	۱۴۵۰
۶۶ المستنجد باللہ	۸۵۹	۱۴۵۴
۶۷ المتوکل علی اللہ	۸۸۴	۱۴۷۹
۶۸ المستمسک باللہ	۹۰۳	۱۴۹۷
۶۹ المتوکل علی اللہ	۹۱۲	۱۵۰۶

سلسلۂ عثمانیہ

۷۰ سلیم خان اوّل	۹۲۳	۱۵۱۷
۷۱ سلیمان اوّل	۹۲۶	۱۵۲۰
۷۲ سلیم ثانی	۹۷۴	۱۵۶۶
۷۳ مراد ثالث	۹۸۲	۱۵۷۴
۷۴ محمد ثالث	۱۰۰۴	۱۵۹۶
۷۵ احمد اوّل	۱۰۱۲	۱۶۰۴
۷۶ مصطفی اوّل	۱۰۲۷	۱۶۲۸
۷۷ عثمان ثانی	۱۰۲۷	۱۶۱۸
۷۸ مراد رابع	۱۰۳۲	۱۶۲۳
۷۹ ابراہیم اوّل	۱۰۴۹	۱۶۴۰

سے جوان مقاماتِ مقدسہ میں جائیں، کوئی چھیڑ نہ کی جائے۔ ہز مجسٹی
کی گورنمنٹ کی استدعا پر گورنمنٹ فرانس و روس نے بھی اسی طرح
کا یقین دلایا ہے۔

(۲) ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور
تقریر میں کہا:

"ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ٹرکی کو اس کے دار الخلافے
سے محروم کر دیں۔ یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز و شہرۂ آفاق
علاقے لیں جن میں ترکی انسل آبادی کا جزو غالب ہے۔

ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی
ہے وہاں ترکوں کی سلطنت قائم رہے، قسطنطنیہ اس کا پایۂ حکومت
ہے۔ البتہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کے درمیانی راستہ کو بین الاقوامی
ضبط و نگرانی میں لانے کے بعد ہماری رائے میں عرب، آرمینیا،
عراق، شام اور فلسطین اپنی اپنی جداگانہ قومی حکومتوں کے مستحق ہیں"

وزیر اعظم نے یہ جو کچھ کہا تھا؟ کیا محض ان کی ذاتی رائے تھی جس کی .....
ذمہ داری صرف ان پر عائد ہوتی ہے؟ یا برطانیہ کا سرکاری اعلان تھا؟ اور
اگر سرکاری اعلان تھا تو صرف وزارت اور اس کی گورنمنٹ کا تھا، یا تمام برٹش
قوم اور امپائر کا؟

اس کا جواب اس تمہید سے ملتا ہے جو اس تقریر کے ابتدا میں موجود ہے
"اس تمام بحث و گفتگو کے بعد جو قلمرو کے مختلف الخیال اور مختلف الرائے

(۳)

مواعید و عہود

اس کتاب میں گورنمنٹ انگلستان و ہند کے جن وعدوں اور سرکاری اعلانات کی طرف جابجا اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

(۱) گورنمنٹ آف انڈیا کا اعلان جو ٹرکی کے شامل جنگ ہونے کے بعد ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا۔

برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ برطانیہ کو اس کا سخت افسوس ہے کہ یہ بڑے منشور سے اور بلا کسی اشتعال کے اور خوب سوچ سمجھ کر دولت عثمانیہ کی طرف سے عمل میں آتی ہے لہٰذا ہز ایکسلنسی وائسرائے ہند ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدسہ کے بارے میں جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہے مندرجہ ذیل اعلانات کرتے ہیں "کہ ہز مجیسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو ما جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

ان مقامات مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانی بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا۔ نہ ان کو ستایا جائے گا جب تک کہ حجاج و زائرین ہند

ایفاءِ عہد

یہ وعدے جس طرح پورے کیے گئے، ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:

(۱) گورنمنٹ ہند نے عراق پر حملہ کیا۔ جس کا بڑا حصہ جزیرۂ عرب کے مقدس حدود میں داخل ہے۔

(۲) ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء کو بصرہ پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی بندرگاہ اور زیارت گاہ ہے۔

(۳) ۲۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پارک پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار ہے۔

(۴) مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

(۵) ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس میں برطانوی فوجیں داخل ہوئیں اور انگریزی قبضہ کا اعلان کیا گیا جو اسلام کی مقدس زیارت گاہ اور تین مقدس مقامات میں سے ایک ہے۔

(۶) ۵ جون ۱۹۱۹ء کو خاص سرزمین حجاز میں سازش کی گئی اور شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت وخون کا بازار گرم ہوا اور حدودِ حرم میں گولہ باری ہوئی۔

(۷) حسبِ تصریح نامہ نگار لندن ٹائمس بندرگاہ جدّہ پر گولہ باری کی گئی۔

(۸) میجر راس کے ہوائی جہاز نے عین مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے (جیسا کہ ڈاکٹر ہاگرتھ نے فروری ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال آکسفورڈ کی تقریر میں بیان کیا۔)

طبقوں کے نمائندوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ میں خوشی سے اس بات کا اظہار
کرتا ہوں کہ آج جو کلمات کہوں گا۔ ان کے لیے گو تنہا حکومت ہی
ذمہ دار ہو گی۔ مگر ہمارے جنگی مقاصد، شرائط صلح کی نوعیت اور
اس کی غرض و غایت کے متعلق میرے جو بیانات آپ سے اور
آپ کی معرفت تمام دنیا سے ہوں گے، ان سے تمام قوم متحد و متفق
ہے۔ میں دلیری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف
گورنمنٹ کے مافی الضمیر ہی کی نہیں بلکہ تمام قوم اور تمام قلمرو کی بحیثیت مجموعی
ترجمانی کر رہا ہوں۔ پھر ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء کو ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرتے
ہوئے اس اعلان کی نسبت وزیرِ اعظم کہتے ہیں۔

"ہمارا وہ اعلان بہت وسیع المعنی تھا اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا
تھا۔ تمام جماعتوں کی مرضی کے مطابق تھا۔ مزدوروں کی جماعت بھی
اس سے متفق تھی۔

(۳) پریسیڈنٹ امریکہ مسٹر ولسن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو چودہ شرطوں کا اعلان
کیا تھا جو باتفاق فریقین صلح کے لیے بنیادی شرطیں قرار پائی تھیں۔
ان میں بارھویں شرط یہ تھی۔

"موجودہ سلطنت عثمانی میں ترکی کا جو حصہ ہے اس کو یقین دلایا جائے
گا کہ اس کی وہ سلطنت محفوظ رہے گی۔ لیکن دوسری اقوام جو سلطنت
ترکی کے زیرِ حکومت ہیں، ان کو بھی اس کا اطمینان دلا دیا جائے کہ
ان کی جان و مال محفوظ رہے، اور ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی۔

نہیں رہتا۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے:

"حکومت ٹرکی اپنے ان تمام اختیارات سے جو حکم برداری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی ہے بالکل دست بردار ہوتی ہے۔ ٹرکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کے اختیارات ان ممالک پر نہ رکھے گی جو ٹرکی سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔"

حالانکہ شرعاً منصب خلافت کے معنی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں پر اس کو ایک بالاتر اختیار حاصل ہو۔ اور وہ تمام اسلامی دنیا میں ایک مرکزی اسلامی اقتدار کی حیثیت رکھے لیکن اس دفعہ نے ٹرکی کو ان تمام اختیاراتِ خلافت سے محروم کر دیا۔ اور اسلامی خلافت اپنے کامل معنوں میں پارہ پارہ ہو گئی۔

(۱۵) شام کو ٹرکی سے الگ کر کے آزادی نہیں دی گئی بلکہ فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کیا گیا۔ شام کی تمام آبادی انسانیت و صداقتِ عہد کے نام پر فریاد کرتی رہی اور فرانس کی فوجوں نے اس پر جبراً قبضہ کر لیا۔

(۱۶) عراق کی آبادی کو خود مختاری و آزادی نہیں دی گئی بلکہ برطانیہ نے اس کی حکم برداری کا دعویٰ کیا اور اس پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ وہاں کی آبادی ایفائے عہد کا مطالبہ کرتے کرتے مایوس ہو گئی اور اب بزور شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہے۔ اب ان کو باغی کہا جا رہا ہے حالانکہ اگر برطانیہ کے اعلانات سچے تھے اور اس کی فوجیں "رعایا" بنانے

(۹) کوفہ، کربلائے معلّیٰ، نجف اشرف پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

(۱۰) ترکی کو تھریس کے کل علاقہ سے مع ایڈریانوپل کے محروم کر دیا گیا جہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ہے۔

(۱۱) صلح نامہ ٹرکی کی دفعہ ۳۶ کے مطابق ٹرکی سے اس کے دارالسلطنت کی خودمختارانہ فرمانروائی بھی سلب کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

(۱۲) سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور زرخیز مقام ہے، ٹرکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے اس قدر ظلم و ستم کیے، کہ بے شمار جانیں ہلاک و تباہ ہو گئیں اور ہو رہی ہیں۔

(۱۳) صلح نامہ کی شرائط نے بقیہ ایشیائے کوچک کے مالی اور ہر طرح کے فوجی اختیارات کی خودمختاری سے بھی ٹرکی کو محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتی۔ چند چھوٹے جنگی جہازوں کے علاوہ کوئی بحری قوت حاصل نہیں کر سکتی۔ اپنی عیسائی رعایا پر اُسے کوئی اختیار نہیں رہا اس کی حیثیت بالکل ایک ماتحت ریاست کی سی ہو گئی ہے جو برائے نام پادشاہت سے متقلب کر دی گئی ہو۔

(۱۴) صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی و اسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انہیں حاصل تھے اور جن کے الگ کر دینے کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی

کے لیے نہیں بلکہ آزاد کرانے کے لیے گئی تھیں، تو وہ "باغی" کیونکر ہو سکتے ہیں؟ بغاوت کا اطلاق رعایا کی شورش پر ہوتا ہے نہ کہ کسی آزاد جماعت کی شمشیر زنی پر!

(۱۷) یہ تمام نتائج صلح نامہ ٹرکی کے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ٹرکی اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ صلح کرے، برٹش فوجوں نے دارالخلافت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بالکل ایک نظر بند قیدی کی سی ہو گئی۔ اس قبضہ کی وجہ سے اسلام کے دارالخلافت میں جو درد انگیز واقعات وحوادث پیش آئے، اور عثمانی خلافتِ عظمیٰ کی متصل پانچ صدیوں میں پہلی مرتبہ جو توہین ہوئی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ وہ سلوک ہے جو نہ تو جرمنی کے ساتھ کیا گیا۔ نہ آسٹریلیا کے ساتھ، اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔

